جاوید احمد غامدی

روزہ

نماز اور زکوٰۃ کے بعد تیسرا فرض روزہ ہے۔ یہ روزہ کیا ہے؟ انسان کے نفس پر جب اس کی خواہشیں غلبہ پا لیتی ہیں تو وہ اپنے پروردگار سے غافل اور اس کے حدود سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی غفلت اور بے پروائی کی اصلاح کے لیے ہم پر روزہ فرض کیا ہے۔ یہ عبادت سال میں ایک مرتبہ پورے ایک مہینے تک کی جاتی ہے۔ رمضان آتا ہے تو صبح سے شام تک ہمارے لیے کھانے پینے اور بیویوں کے ساتھ خلوت کرنے پر پابندی لگ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اس نے یہ عبادت ہم سے پہلی امتوں پر بھی اسی طرح فرض کی تھی جس طرح ہم پر فرض کی ہے۔ ان امتوں کے لیے، البتہ اس کی شرطیں ذرا سخت تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے جس طرح دوسری سب چیزوں کو ہلکا کیا، اسی طرح اس عبادت کو بھی بالکل معتدل بنا دیا ہے۔ تاہم دوسری سب عبادتوں کے مقابلے میں یہ اس لیے ذرا بھاری ہے کہ اس کا مقصد ہی نفس کے منہ زور رجحانات کو لگام دے کر ان کا رخ صحیح سمت میں موڑنا اور اسے حدود کا پابند بنا دینا ہے۔ یہ چیز، ظاہر ہے کہ تربیت میں ذرا سختی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

سحری کے وقت ہم کھا پی رہے ہوتے ہیں کہ یکایک اذان ہوتی ہے اور ہم فوراً ہاتھ روک لیتے ہیں۔ اب خواہشیں کیسا ہی زور لگائیں، دل کیسا ہی مچلے، طبیعت کیسی ہی ضد کرے، ہم ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جن سے روزے کے دوران میں ہمیں روک دیا گیا ہے۔ یہ ساری رکاوٹ اس وقت تک رہتی ہے، جب تک مغرب کی اذان نہیں ہوتی۔ روزہ ختم کر دینے کے لیے ہمارے رب نے یہی وقت مقرر کیا ہے۔ چنانچہ مغرب کے وقت موذن جیسے ہی بولتا ہے، ہم فوراً افطار کے لیے لپکتے ہیں۔ اب رات بھر ہم پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ رمضان کا پورا مہینا ہم اسی طرح گزارتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وقتی طور پر اگرچہ کچھ کمزوری اور کام کرنے کی صلاحیت میں

کمی تو محسوس کرتے ہیں، لیکن اس سے صبر اور تقویٰ کی وہ نعمت ہم کو حاصل ہوتی ہے جو اس زمین پر اللہ کا بندہ بن کر رہنے کے لیے ہماری روح کی اسی طرح ضرورت ہے، جس طرح ہوا اور پانی اور غذا ہمارے جسم کی ضرورت ہے۔ اس سے یہ حقیقت کھلتی ہے کہ آدمی صرف روٹی ہی سے نہیں جیتا، بلکہ اس بات سے جیتا ہے جو اس کے رب کی طرف سے آتی ہے۔

یہ روزہ ہر عاقل و بالغ مسلمان پر فرض ہے، لیکن وہ اگر مرض یا سفر یا کسی دوسرے عذر کی بنا پر رمضان میں یہ فرض پورا نہ کر سکے تو جتنے روزے چھوٹ جائیں، ان کے بارے میں اجازت ہے کہ وہ رمضان کے بعد کسی وقت رکھ لیے جائیں۔ روزوں کی تعداد ہر حال میں پوری ہونی چاہیے۔

اس روزے سے ہم بہت کچھ پاتے ہیں۔ سب سے بڑی چیز اس سے یہ حاصل ہوتی ہے کہ ہماری روح خواہشوں کے زور سے نکل کر علم و عقل کی ان بلندیوں کی طرف پرواز کے قابل ہو جاتی ہے، جہاں آدمی دنیا کی مادی چیزوں سے برتر اپنے رب کی بادشاہی میں جیتا ہے۔

اس مقصد کے لیے روزہ ان سب چیزوں پر پابندی لگاتا ہے جن سے خواہشیں بڑھتی ہیں اور لذتوں کی طرف میلان میں اضافہ ہوتا ہے۔ بندہ جب یہ پابندی جھیلتا ہے تو اس کے نتیجے میں زہد و فقیری کی جو حالت اس پر طاری ہو جاتی ہے، اس سے وہ دنیا سے ٹوٹتا اور اپنے رب سے جڑتا ہے۔ روزے کا یہی پہلو ہے جس کی بنا پر اللہ نے فرمایا ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور اس کی جزا بھی میں اپنے ہاتھ سے دوں گا، اور فرمایا کہ روزے دار کے منہ کی بو مجھے مشک کی خوش بو سے زیادہ پسند ہے۔

ہر اچھے کام کا اجر سات سو گنا ہو سکتا ہے، لیکن روزہ اس سے بھی آگے ہے۔ اس کی جزا کیا ہو گی؟ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ جب بدلے کا دن آئے گا تو وہ یہ بھید کھولے گا اور خاص اپنے ہاتھ سے ہر روزے دار کو اس کے عمل کا صلہ دے گا۔ پھر کون اندازہ کر سکتا ہے کہ آسمان و زمین کا مالک جب اپنے ہاتھ سے صلہ دے گا تو اس کا بندہ کس طرح نہال ہو جائے گا۔

دوسری چیز اس سے یہ حاصل ہوتی ہے کہ انسان کے وجود میں فتنے کے دروازے بڑی حد تک بند ہو جاتے ہیں۔ یہ زبان اور شرم گاہ، یہی دونوں وہ جگہیں ہیں جہاں سے شیطان بالعموم انسان پر حملہ کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص مجھے ان دو چیزوں کے بارے میں ضمانت دے گا جو اس کے دونوں گالوں اور دونوں

ٹانگوں کے درمیان ہیں، میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ روزہ ان دونوں پر پہرا بٹھا دیتا ہے اور صرف کھانا پینا ہی نہیں، زبان اور شرم گاہ میں حد سے بڑھنے کے جتنے میلانات ہیں، ان سب کو کمزور کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ آدمی کے لیے وہ کام بہت آسان ہو جاتے ہیں جن سے اللہ کی رضا اور جنت مل سکتی اور ان کاموں کے راستے اس کے لیے بڑی حد تک بند ہو جاتے ہیں جن سے اللہ ناراض ہوتا ہے اور جن کی وجہ سے وہ دوزخ میں جائے گا۔ یہی حقیقت ہے جسے اللہ کے نبی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ روزوں کے مہینے میں شیطان کو بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں۔

تیسری چیز یہ حاصل ہوتی ہے کہ انسان کا اصلی شرف، یعنی ارادے کی قوت اس کی شخصیت میں نمایاں ہو جاتی ہے اور اس طریقے پر تربیت پا لیتی ہے کہ وہ اس کے ذریعے سے اپنی طبیعت میں پیدا ہونے والے ہر ہیجان کو اس کے حدود میں رکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ارادے کی یہ قوت اگر کسی شخص میں کمزور ہو تو وہ نہ اپنی خواہشوں کو بے لگام ہونے سے بچا سکتا ہے، نہ اللہ کی شریعت پر قائم رہ سکتا ہے اور نہ طمع، اشتعال، نفرت اور محبت جیسے جذبوں کو اعتدال پر قائم رکھ سکتا ہے۔ یہ سب چیزیں انسان سے صبر چاہتی ہیں اور صبر کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان میں ارادے کی قوت ہو۔ روزہ اس قوت کو بڑھاتا اور اس کی تربیت کرتا ہے۔ پھر یہی قوت انسان کو برائی کے مقابلے میں اچھائی پر قائم رہنے میں مدد دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نبی نے روزے کو ڈھال کہا اور انسان کو بتایا کہ وہ برائی کی ہر ترغیب کے سامنے یہ ڈھال اس طرح استعمال کرے کہ جہاں کوئی شخص اسے برائی پر ابھارے، وہ اس کے جواب میں یہ کہہ دے کہ میں تو روزے سے ہوں۔

چوتھی چیز یہ حاصل ہوتی ہے کہ انسان میں ایثار کا جذبہ ابھرتا ہے اور اسے دوسروں کے دکھ درد کو سمجھنے اور ان کے لیے کچھ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ روزے میں آدمی کو بھوک اور پیاس کا جو تجربہ ہوتا ہے، وہ اسے غریبوں کے قریب کر دیتا ہے اور ان کی ضرورتوں کا صحیح احساس اس میں پیدا کرتا ہے۔ روزے کا یہ اثر، بے شک کسی پر کم پڑتا ہے اور کسی پر زیادہ، لیکن ہر شخص کی صلاحیت اور اس کی طبیعت کی سلامتی کے لحاظ سے پڑتا ضرور ہے۔ وہ لوگ جو اس اعتبار سے زیادہ حساس ہوتے ہیں، ان کے اندر تو گویا دریا امنڈ پڑتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ آپ یوں تو ہر حال میں بے حد فیاض تھے، مگر رمضان میں تو بس جود و کرم کے بادل بن جاتے اور اس طرح برستے کہ ہر طرف جل تھل ہو جاتا تھا۔

پانچویں چیز یہ حاصل ہوتی ہے کہ رمضان کے مہینے میں روزے دار کو جو خلوت اور خاموشی اور دوسروں سے کسی حد

تک الگ تھلگ ہو جانے کا موقع ملتا ہے، اس میں قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے معنی کو سمجھنے کی طرف بھی طبیعت زیادہ مائل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ کتاب اسی ماہ رمضان میں اتاری اور اسی نعمت کی شکر گزاری کے لیے اس کو روزوں کا مہینا بنا دیا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جبریل علیہ السلام بھی اسی مہینے میں قرآن سننے اور سنانے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے۔ روزے سے قرآن مجید کی یہی مناسبت ہے جس کی بنا پر امت کے اکابر اس مہینے میں اپنے نبی کی پیروی میں رات کے پچھلے پہر اور عام لوگ آپ ہی کی اجازت سے عشا کے بعد نفلوں میں اللہ کا کلام سنتے اور سناتے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کی راتوں میں نماز کے لیے کھڑا رہا، اس کا یہ عمل اس کے پچھلے گناہوں کی معافی کا ذریعہ بن جائے گا۔

چھٹی چیز یہ حاصل ہوتی ہے کہ آدمی اگر چاہے تو اس مہینے میں بہت آسانی کے ساتھ اپنے پورے دل اور پوری جان کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ اللہ کے بندے اگر یہ چیز آخری درجے میں حاصل کرنا چاہیں تو اس کے لیے اسی رمضان میں اعتکاف کا طریقہ بھی مقرر کیا گیا ہے۔ یہ اگرچہ ہر شخص کے لیے ضروری نہیں ہے، لیکن دل کو اللہ کی طرف لگانے کے لیے یہ بڑی اہم عبادت ہے۔ اعتکاف کے معنی ہمارے دین میں یہ ہیں کہ آدمی دس دن یا اپنی سہولت کے مطابق اس سے کم کچھ دنوں کے لیے سب سے الگ ہو کر اپنے رب سے لو لگا کر مسجد میں بیٹھ جائے اور اس عرصے میں کسی ناگزیر ضرورت ہی کے لیے وہاں سے نکلے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں اکثر اس کا اہتمام فرماتے تھے اور خاص طور پر اس ماہ کے آخری دس دنوں میں رات کو خود بھی زیادہ جاگتے، اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے اور پوری مستعدی کے ساتھ اللہ کی عبادت میں لگے رہتے تھے۔

یہ سب چیزیں روزے سے حاصل ہو سکتی ہیں، مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ روزے دار ان خرابیوں سے بچیں جو اگر روزے میں در آئیں تو اس کی ساری برکتیں بالکل ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ خرابیاں اگرچہ بہت سی ہیں، لیکن ان میں بعض ایسی ہیں کہ ہر روزے دار کو ان کے بارے میں ہر وقت ہوشیار رہنا چاہیے۔

ان میں سے ایک خرابی یہ ہے کہ لوگ رمضان کو لذتوں اور چٹخاروں کا مہینا بنا لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس مہینے میں جو بھی خرچ کیا جائے، اس کا اللہ کے ہاں کوئی حساب نہیں ہے۔ چنانچہ اس طرح کے لوگ اگر کچھ کھاتے پیتے بھی ہوں تو ان کے لیے تو پھر یہ مزے اڑانے اور بہار لوٹنے کا مہینا ہے۔ وہ اس کو نفس کی تربیت کے بجائے اس کی پرورش کا مہینا بنا لیتے ہیں اور ہر روز افطار کی تیاریوں ہی میں صبح کو شام کرتے ہیں۔ وہ جتنا وقت روزے سے ہوتے

ہیں، یہی سوچتے ہیں کہ سارے دن کی بھوک پیاس سے جو خلا ان کے پیٹ میں پیدا ہوا ہے، اسے وہ اب کن کن نعمتوں سے بھریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو روزے سے وہ کچھ پاتے ہی نہیں اور اگر کچھ پاتے ہیں تو اسے وہیں کھو دیتے ہیں۔

اس خرابی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر کام کی قوت کو باقی رکھنے کے لیے کھائے پیے تو ضرور، لیکن اس کو جینے کا مقصد نہ بنا لے۔ جو کچھ بغیر کسی اہتمام کے مل جائے، اس کو اللہ کا شکر کرتے ہوئے کھا لے۔ گھر والے جو کچھ دستر خوان پر رکھ دیں، وہ اگر دل کو نہ بھی بھائے تو اس پر خفا نہ ہو۔ اللہ نے اگر مال و دولت سے نوازا ہے تو اپنے نفس کو پالنے کے بجائے، اسے غریبوں اور فقیروں کی مدد اور ان کے کھلانے پلانے پر خرچ کرے۔ یہ چیز یقیناً اس کے روزے کی برکتوں کو بڑھائے گی۔ روایتوں میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی نے رمضان میں اس عمل کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ بھوک اور پیاس کی حالت میں چونکہ طبیعت میں کچھ تیزی پیدا ہو جاتی ہے، اس وجہ سے بعض لوگ روزے کو اس کی اصلاح کا ذریعہ بنانے کے بجائے، اسے بھڑکانے کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں اور اپنے نیچے کام کرنے والوں پر ذرا ذرا سی بات پر برس پڑتے، جو منہ میں آیا، کہہ گزرتے، بلکہ بات بڑھ جائے تو گالیوں کا جھاڑ باندھ دیتے ہیں اور بعض حالتوں میں اپنے زیر دستوں کو مارنے پیٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے ہیں کہ روزے میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

اس کا علاج اللہ کے نبی نے یہ بتایا ہے کہ آدمی اس طرح کے سب موقعوں پر روزے کو اس اشتعال کا بہانہ بنانے کے بجائے اس کے مقابلے میں ایک ڈھال کی طرح استعمال کرے، اور جہاں اشتعال کا کوئی موقع پیدا ہو، فوراً یاد کرے کہ میں روزے سے ہوں۔ وہ اگر غصے اور اشتعال کے ہر موقع پر یاد دہانی کا یہ طریقہ اختیار کرے گا تو آہستہ آہستہ دیکھے گا کہ بڑی سے بڑی ناگوار باتیں بھی اب اسے گوارا ہیں۔ وہ محسوس کرے گا کہ اس نے اپنے نفس کے شیطان پر اتنا قابو پا لیا ہے کہ وہ اب اسے گرا لینے میں کم ہی کامیاب ہوتا ہے۔ شیطان کے مقابلے میں فتح کا یہ احساس اس کے دل میں اطمینان اور برتری کا احساس پیدا کرتا ہے اور روزے کی یہی یاد دہانی اس کی اصلاح کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ پھر وہ وہیں غصہ کرتا ہے، جہاں اس کا موقع ہوتا ہے۔ وقت بے وقت اسے مشتعل کر دینا کسی کے لیے ممکن نہیں رہتا۔

تیسری خرابی یہ ہے کہ بہت سے لوگ جب روزے میں کھانے پینے اور اس طرح کی دوسری دل چسپیوں کو چھوڑتے ہیں تو اپنی اس محرومی کا مداوا ان دل چسپیوں میں ڈھونڈنے لگتے ہیں جن سے ان کے خیال میں روزے کو کچھ نہیں ہوتا، بلکہ وہ بہل جاتا ہے۔ وہ روزہ رکھ کر تاش کھیلیں گے، ناول اور افسانے پڑھیں گے، نغمے اور غزلیں سنیں گے، فلمیں دیکھیں گے، دوستوں میں بیٹھ کر گپیں ہانکیں گے اور اگر یہ سب نہ کریں گے تو کسی کی غیبت اور ہجو ہی میں لپٹ جائیں گے۔ روزے میں پیٹ خالی ہو تو آدمی کو اپنے بھائیوں کا گوشت کھانے میں ویسے بھی بڑی لذت ملتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات صبح اس مشغلے میں پڑتے ہیں اور پھر موذن کی اذان کے ساتھ ہی اس سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔

اس خرابی کا ایک علاج تو یہ ہے کہ آدمی خاموشی کو روزے کا ادب سمجھے اور زیادہ سے زیادہ یہی کوشش کرے کہ اس کی زبان پر کم سے کم اس مہینے میں تو تالا لگا رہے۔ اللہ کے نبی نے فرمایا کہ آدمی اگر ہر قسم کی جھوٹی سچی باتیں زبان سے نکالتا ہے تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ جو وقت ضروری کاموں سے بچے، اس میں آدمی قرآن و حدیث کا مطالعہ کرے اور دین کو سمجھے۔ وہ روزے کی اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر اس میں قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی دعاؤں کا کچھ حصہ یاد کرلے۔ اس طرح وہ اس وقت ان مشغلوں سے بچے گا اور بعد میں یہی ذخیرہ اللہ کی یاد کو اس کے دل میں قائم رکھنے کے لیے اس کے کام آئے گا۔

چوتھی خرابی یہ ہے کہ آدمی بعض اوقات روزہ اللہ کے لیے نہیں، بلکہ اپنے گھر والوں اور ملنے جلنے والوں کی ملامت سے بچنے کے لیے رکھتا ہے اور کبھی لوگوں میں اپنی دین داری کا بھرم قائم رکھنے کے لیے یہ مشقت جھیلتا ہے۔ یہ چیز بھی روزے کو روزہ نہیں رہنے دیتی۔

اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی روزے کی اہمیت ہمیشہ اپنے نفس کے سامنے واضح کرتا رہے اور اسے تلقین کرے کہ جب کھانا پینا اور دوسری لذتیں چھوڑ ہی رہے ہو تو پھر انھیں اللہ کے لیے کیوں نہیں چھوڑتے۔ اس کے ساتھ رمضان کے علاوہ کبھی کبھی نفلی روزے بھی رکھے اور انھیں زیادہ سے زیادہ چھپانے کی کوشش کرے۔ اس سے امید ہے کہ اس کے یہ فرض روزے بھی کسی وقت اللہ ہی کے لیے خالص ہو جائیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانفال

(۵)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی
وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا

(تم نے پوچھا تھا تو) جان لو[۲] کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا تھا، اُس کا پانچواں حصہ اللہ، اُس کے پیغمبر، (پیغمبر کے) اقربا اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے خاص رہے گا۔[۳] اگر تم اللہ پر

۲؎ اموال غنیمت سے متعلق چونکہ ناروا قسم کے سوالات اٹھا دیے گئے تھے، اِس لیے لوگوں کی کمزوریوں پر تبصرے کے بعد اب فیصلہ سنایا ہے تو آغاز اِس تنبیہی کلمے سے کیا ہے۔

۳؎ پیچھے بیان ہو چکا ہے کہ زمانۂ رسالت کی جنگوں پر اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ یہ سب اللہ و رسول کا ہے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ اِس کے باوجود یہ سارا مال نہیں، بلکہ اِس کا پانچواں حصہ ہی اجتماعی مقاصد کے لیے خاص رہے گا اور باقی از راہ عنایت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ یہ تقسیم بھی صاف واضح ہے کہ صرف اِس وجہ سے کی گئی ہے کہ لوگوں نے جنگ بہر حال لڑی تھی۔ اُس کے لیے زادراہ کا بندوبست بھی کیا تھا اور اُس کی ضرورتوں کے لیے اسلحہ، گھوڑے اور اونٹ وغیرہ بھی خود ہی مہیا کیے تھے۔ لہٰذا جب اِس طرح کے اموال مسلمانوں کو حاصل ہوئے جن کے لیے اُنھیں یہ اہتمام نہیں کرنا پڑا تو سورۂ حشر (۵۹) کی آیات ۶-۸ میں قرآن

نے واضح کر دیا کہ یہ سب دین وملت کی ضرورتوں اور قوم کے غربا و مساکین کے لیے خاص کر دیا گیا ہے، اِس کا کوئی حصہ بھی مجاہدین میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ آیۂ زیر بحث میں اللہ تعالیٰ نے اِن اجتماعی مقاصد کی تفصیل کر دی ہے۔

سب سے پہلے اللہ کا حق بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ، ظاہر ہے کہ ہر چیز سے غنی اور بے نیاز ہے۔ اُس کے نام کا حصہ اُس کے دین ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ لہٰذا اِس کا اصلی مصرف وہ کام ہوں گے جو دین کی نصرت اور حفاظت و مدافعت کے لیے مسلمانوں کا نظم اجتماعی اپنی دینی ذمہ داری کی حیثیت سے انجام دیتا ہے۔

دوسرا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا گیا ہے۔ آپ کی شخصیت میں اُس وقت نبوت و رسالت کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت کے سربراہ کی ذمہ داری بھی جمع ہو گئی تھی اور آپ کے اوقات کا لمحہ لمحہ اپنے یہ منصبی فرائض انجام دینے میں صرف ہو رہا تھا۔ اِس ذمہ داری کے ساتھ اپنی معاش کے لیے کوئی کام کرنا آپ کے لیے ممکن نہ تھا۔ اِس صورت حال میں ضروری تھا کہ اِس مال میں آپ کا حق بھی رکھا جائے۔ اِس کی نوعیت کسی ذاتی ملکیت کی نہیں تھی کہ اِسے آپ کے وارثوں میں تقسیم کیا جاتا۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد یہ آپ سے آپ اُن کاموں کی طرف منتقل ہو گیا جو آپ کی نیابت میں مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے لیے انجام دینا ضروری تھے۔

تیسرا حق 'ذی القربیٰ' کا بیان کیا گیا ہے۔ اِس سے، ظاہر ہے کہ آپ کے وہ قرابت دار مراد ہیں جن کی کفالت آپ کے ذمے تھی اور جن کی ضرورتیں پوری کرنا اخلاقی لحاظ سے آپ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ آپ کی حیثیت تمام مسلمانوں کے باپ کی تھی۔ چنانچہ آپ کے بعد یہ ذمہ داری عرفاً و شرعاً مسلمانوں کے نظم اجتماعی کو منتقل ہوئی اور ذی القربیٰ کا حق بھی، جب تک وہ دنیا میں رہے، اِسی طرح قائم رہا۔

چوتھا حق یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا ہے۔ اُن کا حق بیان کرتے ہوئے 'ل' کا اعادہ نہیں فرمایا جو اوپر اللہ، رسول اور ذی القربیٰ، تینوں کے ساتھ آیا ہے، بلکہ اُن کا ذکر ذی القربیٰ کے ذیل ہی میں کر دیا ہے۔ اِس سے مقصود اِس طبقے کی عزت افزائی ہے کہ گویا یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا ہی کے تحت ہیں۔ یہ حق کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ ہر وہ معاشرہ جو اِن طبقات کی ضرورتوں کے لیے حساس نہیں ہے، جس میں یتیم دھکے کھاتے، مسکین بھوکے سوتے اور مسافر اپنے لیے کوئی پرسان حال نہیں پاتے، اُسے اسلامی معاشرے کا پاکیزہ نام نہیں دیا جا سکتا۔

يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴿۴۱﴾
اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ
وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ

ایمان رکھتے ہو اور اُس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتاری تھی[۴] جس دن دونوں گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی تھی (تو بے چون و چرا اِس حکم کی تعمیل کرو اور جان رکھو کہ) اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[۵]۔ ۴۱

یاد کرو، جب تم وادی کے قریبی کنارے[۶] پر تھے اور وہ دور کے کنارے پر، اور قافلہ تم سے نیچے تھا۔ اگر تم باہم وقت ٹھیرا کر نکلتے تو جو وقت ٹھیراتے، اُس میں لازماً آگے پیچھے ہو جاتے[۷]۔ لیکن (اللہ نے

۴؎ یعنی وہ تائید و نصرت جو بدر کے مواقع پر نازل کی گئی۔ فیصلے کے دن سے مراد غزوۂ بدر کا دن ہے۔ اُس کو فیصلے کے دن سے تعبیر کرنے کی وجہ پیچھے بیان ہو چکی ہے۔

۵؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ روے سخن اُنھی نکتہ چینوں کی طرف ہے جنھوں نے اموال غنیمت سے متعلق سوالات اٹھائے تھے۔ اِس جملے میں ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یوں نہیں فرمایا کہ اگر تم اُس نصرت الٰہی پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے تم پر اتاری، بلکہ یوں فرمایا کہ 'اپنے بندے پر اتاری'، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ کسی گروہ کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ کامیابی جو حاصل ہوئی ہے، یہ اُس کا کارنامہ ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے، اللہ کی کارسازی اور اُس رسول کی برکت سے ہوا ہے جس کی مدد کے لیے اللہ نے اپنی غیبی فوج بھیجی۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ نہ اللہ کسی کا محتاج ہے اور نہ اُس کا رسول کسی کا دست نگر ہے۔ اللہ جب چاہے گا، اپنے رسول کی مدد کے لیے اپنی افواج قاہرہ بھیج دے گا۔" (تدبر قرآن ۳/ ۴۸۳)

۶؎ یعنی اُس کنارے پر جو مدینے سے قریب تھا۔

۷؎ مطلب یہ ہے کہ اگر تم دونوں فریق اپنے طور پر یہ طے کر کے نکلتے کہ ایک کو قافلے کی حفاظت کا بہانہ بنا کر حملہ کرنا ہے اور دوسرے کو اِس موقع سے فائدہ اٹھا کر حملہ آور کو سبق سکھانا اور اُس پر اپنی دھاک بٹھا دینی ہے تو کبھی اِس طرح نہ پہنچ سکتے کہ قافلہ ابھی مسلمانوں کی زد میں ہوتا اور دونوں لشکر آمنے سامنے آ کھڑے ہوتے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ قریش کے دل بادل لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہی قافلہ بہ حفاظت نکل چکا ہوتا اور اُن کے لیے حملے کا

مَنۡ هَلَكَ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحۡيٰى مَنۡ حَىَّ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۴۲﴾ اِذۡ
يُرِيۡكَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ مَنَامِكَ قَلِيۡلًا وَلَوۡ اَرٰكَهُمۡ كَثِيۡرًا لَّفَشِلۡتُمۡ وَلَتَنَازَعۡتُمۡ فِى الۡاَمۡرِ
وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۴۳﴾ وَاِذۡ يُرِيۡكُمُوۡهُمۡ اِذِ الۡتَقَيۡتُمۡ فِىۡۤ

کوئی فرق نہیں ہونے دیا)، اِس لیے کہ اللہ اُس معاملے کا فیصلہ کر دے جس کو ہو کر رہنا تھا تاکہ جس کو ہلاک ہونا ہے، وہ حجت دیکھ کر ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے، وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے[۷۸]۔ بے شک، اللہ سمیع و علیم ہے[۷۹]۔ یاد کرو، (اے پیغمبر) جب اللہ تمھارے خواب میں اُن کو تھوڑا دکھا رہا تھا[۸۰]۔ اگر کہیں زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے اور جو معاملہ درپیش تھا، اُس کے بارے میں جھگڑنے لگتے[۸۱]، مگر اللہ نے بچا لیا[۸۲]۔ یقیناً، وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ اور یاد کرو، جب

کوئی جواز باقی نہ رہتا۔ چنانچہ اُن کے اندر کے لوگ ہی اصرار کرتے کہ ہم جس اندیشے سے نکلے تھے، وہ غلط ثابت ہوا، اب حملہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور وہ مجبور ہو جاتے کہ سب تیاریوں کے باوجود جنگ کیے بغیر ہی مکہ لوٹ جائیں۔

۷۸؎ آیت میں 'هَلَكَ' اور 'حَىَّ' کے ساتھ 'عَنۡ' آیا ہے۔ یہ منبع و مصدر کے مفہوم پر دلالت کے لیے ہے۔ عربی زبان میں یہ اِس مفہوم کے لیے بھی آتا ہے۔ ہلاکت اور زندگی سے مراد روحانی و معنوی ہلاکت اور زندگی ہے اور حجت یا 'بَيِّنَة' سے اُس فرقان کی طرف اشارہ مقصود ہے جو غزوۂ بدر کے موقع پر ظاہر ہوا اور جس نے حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ہر سلیم الطبع انسان پر واضح کر دیا۔

۷۹؎ صفات الٰہی کا یہ حوالہ اُس پوری اسکیم کے تعلق سے آیا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ کہاں تم، کہاں قریش اور کہاں قافلہ، لیکن اللہ تعالیٰ نے سب کے بھید معلوم کر لیے، سب کی سرگوشیاں سن لیں اور سب کے ارادے تاڑ لیے اور پھر سب کو اِس طرح جمع کر کے وہ بات پوری کر کے دکھا دی جو اُس نے طے کر لی تھی، اِس لیے کہ وہ سمیع و علیم ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۴۸۴)

۸۰؎ رویا میں چیزیں بعض اوقات اُن کی معنوی حقیقت کے اعتبار سے دکھائی جاتی ہیں۔ اِس موقع پر بھی یہی ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کا لشکر انتہائی کم تعداد میں نظر آیا۔ یہ اُن کی معنوی قلت تھی جو قلت تعداد کی

اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ

تمھاری مڈبھیڑ کے وقت وہ تم لوگوں کی نگاہوں میں اُنھیں کم کر کے دکھا رہا تھا اور تمھیں اُن کی نگاہوں میں کم کر کے دکھا رہا تھا تاکہ اللہ اُس معاملے کا فیصلہ کر دے جس کو ہو کر رہنا تھا۔[۸۳] (حقیقت یہ ہے کہ) تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔۴۲-۴۴

ایمان والو، جب (آیندہ بھی) کسی گروہ سے تمھارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو[۸۴] تاکہ تم کامیاب ہو۔[۸۵] اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو[۸۶] اور آپس میں جھگڑو نہیں کہ (اِس کے

صورت میں ظاہر ہوئی۔

۸۱۔ یہ اُسی گروہ سے کہا ہے جس کا ذکر سورہ کی ابتدا سے چلا آ رہا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اگر قریش کے لوگ کثیر تعداد میں دکھا دیے جاتے، جتنے کہ وہ فی الواقع تھے تو حضور بھی اُن کا ذکر اُسی صورت میں کرتے۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ جو کمزور مسلمان اتنی قلیل تعداد کا سن کر بھی آمادۂ جنگ نہیں ہو رہے تھے، وہ بالکل ہی ہمت ہار بیٹھتے اور ایسا اختلاف پیدا ہو جاتا کہ جنگ کے لیے نکلنا ہی ممکن نہ رہتا۔

۸۲۔ یعنی کمزوری کے اظہار سے بچا لیا اور کمزور مسلمان بھی کچھ بحث و تمحیص کے بعد مقابلے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

۸۳۔ یعنی اِس لیے کم کر کے دکھا رہا تھا کہ ایک دوسرے کو اِس طرح دیکھ کر کوئی فریق بھی خوف نہ کھائے اور وہ فرقان ظاہر ہو جائے جس کا ظہور خدا کی اسکیم میں طے ہو چکا تھا۔

۸۴۔ اللہ کا ذکر ثابت قدمی کا ذریعہ ہے اور ثابت قدمی اِس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی نصرت اِس کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ یہاں بہت ذکر کرنے کے لیے کہا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ حالات زیادہ صبر آزما ہوں تو ذکر بھی زیادہ مقدار میں مطلوب ہوگا۔

مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۴۶﴾ وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ
وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ مُحِیۡطٌ ﴿۴۷﴾ وَاِذۡ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ

نتیجے میں) ہمت ہار جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ثابت قدم رہو، اِس لیے کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو ثابت قدم رہنے والے ہوں۔[87] تم اُن لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے[88] اور جن کا رویہ یہ ہے کہ خدا کی راہ سے روکتے ہیں، درآں حالیکہ

۸۵۔ اصل الفاظ ہیں: 'لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ'۔ قرآن کی تعبیرات میں 'فَلَاح' ایک جامع لفظ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ دنیا اور آخرت، دونوں کی کامیابی پر مشتمل ہے۔ مجرد غلبہ تو ہو سکتا ہے کہ بغیر ذکر الٰہی کے بھی حاصل ہو جائے، لیکن وہ فلاح کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ فلاح اُسی غلبے سے حاصل ہو گی جس کا دروازہ ذکر الٰہی کی مدد سے کھلے اور جس میں غلبہ حاصل کرنے والوں کو خدا کی معیت حاصل ہو۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۴۸۷)

۸۶۔ اللہ و رسول کی اطاعت کا یہ خاص مفہوم بھی یہاں پیش نظر ہے کہ دشمن کے مقابلے میں پورے نظم اور ڈسپلن کے ساتھ اللہ و رسول کے احکام کی پیروی کی جائے، اِس لیے کہ ذکر الٰہی سے محرومی جس طرح دل و دماغ کو منتشر کر دیتی ہے، ڈسپلن کی کمزوری اِسی طرح جماعت کے نظم کو درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔

۸۷۔ یہی بات اوپر افراد کو پیش نظر رکھ کر ارشاد ہوئی تھی۔ یہاں یہ جماعت کو پیش نظر رکھ کر کہی گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ خدا کی مدد و نصرت اور اُس کی معیت کے طالب ہو تو اپنے جماعتی کردار سے اُس کا استحقاق پیدا کرو۔ خدا منتشر بھیڑ کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ اُن لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جو اُس کی راہ میں جہاد کے لیے بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہوں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۴۸۸)

۸۸۔ یہ اُس طمطراق اور جذبۂ نمایش کا ذکر ہے جس کا مظاہرہ قریش کے لیڈروں نے جنگ بدر کے لیے نکلتے ہوئے کیا تھا۔ مسلمانوں کو اِس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ طنطنہ، طمطراق اور ریا کسی بندۂ مومن کے شایان شان نہیں ہے۔ رزم ہو یا بزم، خدا کے بندوں پر عبدیت کی تواضع اور فروتنی ہر حال میں نمایاں رہنی چاہیے، اِس لیے کہ اُن کی جنگ محض جنگ نہیں، بلکہ اللہ کی عبادت ہے اور ضروری ہے کہ اُس کی یہ شان ہر جگہ قائم رہے۔ اُنھیں جو کچھ کرنا ہے،

اَعۡمَالَهُمۡ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الۡيَوۡمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّىۡ جَارٌ لَّكُمۡ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الۡفِئَتٰنِ
نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيۡهِ وَقَالَ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّنۡكُمۡ اِنِّىۡۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوۡنَ اِنِّىۡۤ اَخَافُ
اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۴۸﴾ اِذۡ يَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ

جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ اُس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یاد کرو، جب شیطان نے اُن کے اعمال اُنھیں خوش نما بنا کر دکھائے اور کہا کہ آج لوگوں میں کوئی نہیں جو تم پر غلبہ پا سکے اور (مطمئن رہو)، میں تمھارے ساتھ ہوں۔ مگر جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور کہنے لگا کہ میں تم سے بری ہوں، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ میں خدا سے ڈرتا ہوں، (حقیقت یہ ہے کہ) خدا سخت سزا دینے والا ہے۔[۸۹] یاد کرو، جب منافقین اور وہ بھی جن کے دلوں کو

ہمیشہ اللہ کے لیے کرنا ہے اور اُس کی داد بھی آخرت میں اُسی سے لینی ہے۔ یہ اخلاص اُن سے جس طرح عبادت میں مطلوب ہے، اُسی طرح جنگ میں بھی مطلوب ہے۔

۸۹؎ شیطان نے یہ باتیں، ظاہر ہے کہ خود سامنے آ کر نہیں کہیں، بلکہ اپنے طریقے کے مطابق انسانوں میں سے اپنے پیرووں سے کہلائیں۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ اِس طرح کے موقعوں پر اُس کی یہ خدمت مدینہ کے یہود انجام دیتے رہے۔ قرین قیاس ہے کہ اِس موقع پر بھی شیطان کی انگیخت سے اُنھی نے پہلے قریش کو بڑھاوے دیے ہوں گے کہ شاباش، آگے بڑھو، آج کس میں دم ہے کہ تمھارا مقابلہ کر سکے، مگر وقت آنے پر پیچھے ہٹ گئے ہوں گے کہ مبادا وہ بھی خدا کے عذاب کی گرفت میں آ جائیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خوب جانتے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہی پیغمبر ہیں جن کے آنے کی پیشین گوئی اُن کے صحیفوں میں کی گئی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ آپ کو اِس طرح پہچانتے تھے، جس طرح کوئی مہجور باپ اپنے بیٹے کو پہچانتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی قوم سے باہر کسی نبوت و رسالت کو وہ کسی قیمت پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، لہٰذا چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا یہ خطرہ مول لے اور اُنھیں اُس آزمایش سے نجات دلا دے جس میں وہ آپ کی بعثت کے بعد مبتلا ہو گئے تھے۔ دونوں لشکروں کو آمنے سامنے دیکھ کر شیطان نے جو کچھ کہا ہے، اُس کا ظہور بھی یہود کے رویے میں ہوا، جبکہ قریش کی پیٹھ ٹھونکنے کے باوجود وہ اُن کا ساتھ دینے کے لیے کھلم کھلا میدان میں نہیں اترے۔ قرآن نے یہاں

غَرَّ ھٰٓؤُلَآءِ دِیۡنُھُمۡ وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۴۹﴾

روگ لگا ہوا ہے، (خود تمھارے متعلق) کہہ رہے تھے کہ اِن کے دین نے اِن لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے[۹۰]، دراں حالیکہ جو اللہ پر بھروسا رکھتے ہیں، (اللہ ضرور اُن کی مدد کرتا ہے)، اِس لیے کہ اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۴۵-۴۹

اشارے کنایے میں اُن کو بھی متنبہ کر دیا ہے اور مسلمانوں کو بھی بتا دیا ہے کہ جو کچھ سامنے دیکھتے ہو، اُس کے پیچھے کون کون چھپا ہوا ہے۔

۹۰؎ یعنی ہوش و خرد سے عاری کر کے اِس خبط میں مبتلا کر دیا ہے کہ ممولے ہو کر بھی شہبازوں سے لڑ سکتے اور چیونٹی ہو کر بھی پہاڑوں سے ٹکرا سکتے ہو۔

[باقی]

محمد رفیع مفتی

فضائل رمضان

دین میں روزہ ایک اہم عبادت ہے۔ یہ عبادت ایک ماہ کے لیے کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات کو کچھ خاص حدود و قیود میں لانا ہے۔

ذیل میں ہم ان احادیث کا مطالعہ کریں گے جو ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ اللہ کے نزدیک اس عبادت کی کیا اہمیت و فضیلت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من صام رمضان ایمانًا و احتسابًا، غفرله ما تقدم من ذنبه. (بخاری، رقم ۳۸)

''جس نے ایمان و احتساب کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے، اُس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لخلوف فم الصائم اطیب عند اللّٰه من ریح المسك. (بخاری، رقم ۱۸۹۴)

''روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ان فی الجنة بابًا، یقال له الریّان، یدخل منه الصائمون یوم القیٰمة، لا یدخل معهم احد غیرهم، یقال: این الصائمون؟ فیدخلون منه، فاذا دخل آخرهم اغلق فلم یدخل

''جنت میں ایک دروازہ ہے جسے ریّان کہا جاتا ہے۔ روزہ دار قیامت کے دن اُس سے جنت میں داخل ہوں گے، اُن کے ساتھ کوئی دوسرا داخل نہ ہو سکے گا۔ پوچھا جائے گا: روزہ دار کہاں ہیں؟ پھر وہ اُس سے

منه احد. (مسلم، رقم ۲۷۱۰)

داخل ہوں گے اور جب اُن میں سے آخری شخص بھی داخل ہو جائے گا تو اُسے بند کر دیا جائے گا۔ اِس کے بعد کوئی اُس دروازے سے داخل نہ ہوگا۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

قـال اللّٰه كل عمل ابن آدم له إلا الصيام فـإنـه لـى وأنـا أجزى به والصيام جنة وإذا كان يوم صوم أحدكم فلا يرفث ولا يصخب فإن سابه أحد أو قاتله فليقل إنـى امـرؤ صـائم والذى نفس محمد بيـده لـخـلوف فم الصائم أطيب عند الـلّٰـه من ريح المسك للصائم فرحتان يـفـرحهـما إذا أفطر فرح وإذا لقى ربه فرح بصومه. (بخاری، رقم ۱۹۰۴)

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: انسان کا ہر نیک عمل اسی کے لیے ہوتا ہے سوائے روزے کے، یہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا، روزہ گناہوں کے آگے ایک ڈھال ہے۔ اگر کسی نے روزہ رکھا ہو تو اسے نہ فحش گوئی کرنی چاہیے، نہ شور مچانا چاہیے اور اگر کوئی دوسرا اسے گالی دے یا اس سے لڑنا چاہے تو اسے بس یہی کہنا چاہیے کہ میں روزے سے ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے، روزہ رکھنے والے کے لیے خوشی کے دو وقت ہیں: ایک جب وہ روزہ کھولتا ہے، دوسرا جب وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کرے گا۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

كل عمل ابن آدم يضاعف الحسنة عشر أمثـالهـا إلـى سبعمائة ضعف قال اللّٰه عز وجل إلا الصوم فإنه لى وأنا أجزى به يدع شهوته وطعامه من أجلى للصائم فـرحتـان فـرحة عند فطره وفرحة عند لقاء ربه. (مسلم، رقم ۱۱۵۱)

''ابن آدم جو نیکی بھی کرتا ہے، اُس کی جزا اُسے دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک دی جاتی ہے، لیکن روزے کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ 'فانه لى وأنا أجزى به' (یہ میرے لیے ہے اور میں ہی اِس کی جزا دوں گا)، اِس لیے کہ بندہ اپنے کھانے پینے اور اپنی جنسی خواہشات کو اِس میں صرف میرے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ روزہ رکھنے والے کے لیے خوشی

کے دو وقت ہیں: ایک جب وہ روزہ کھولتا ہے، دوسرا جب وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کرے گا۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما من عبد یصوم یومًا فی سبیل اللّٰہ الا باعد اللّٰہ بذلك الیوم و جھه عن النار سبعین خریفًا. (مسلم، رقم ۱۱۵۳)

''جو شخص اللہ کی راہ (جہاد) میں ایک دن کا روزہ رکھتا ہے تو اللہ اُس ایک دن کے روزے کی وجہ سے اُس شخص کے چہرے کو جہنم کی آگ سے ستر سال دور کر دیتا ہے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اذا جاء رمضان فتحت ابواب الجنة وغلقت ابواب النار وصفدت الشیاطین. (مسلم، رقم ۱۰۷۹)

''جب رمضان کا مہینا آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے، جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے۔''

ایک صحابی آپ کے پاس آئے اور یہ عرض کی کہ آپ مجھے کسی عمل کا حکم دیں جسے میں آپ کے کہنے پر اختیار کروں، تو آپ نے ارشاد فرمایا:

علیك بالصوم فانه لا مثل له. (نسائی، رقم ۲۲۲۲)

''تمھیں چاہیے کہ تم روزے رکھا کرو، کیونکہ کوئی دوسرا عمل اس کی مثل نہیں ہے۔''

محمد وسیم اختر مفتی

خباب بن ارت رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس
میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

زید مناۃ بن تمیم تمیمی حضرت خباب کے جد امجد تھے۔ان کے دادا کا نام جندلہ بن سعد تھا۔زمانۂ جاہلیت میں ان کے والد ارتؓ بغداد کے نواحی شہر کسکر میں تھے کہ بنوربیعہ کے لوگوں نے کسی غارت گری میں انھیں گرفتار کیا اور مکہ لے آئے۔کسکر ایرانی بادشاہ کسکر بن طہمورث کے نام سے موسوم ہے۔یہ علاقہ سواد کوفہ کے نام سے مشہور ہے اس لیے انھیں سوادی بھی کہا جاتا ہے۔ارتؓ کو سباع بن عبدالعزی خزاعی اور حضرت خباب کو اس کی بہن ام انمار خزاعیہ نے غلاموں کے بازار سے خریدا۔ یہ سباع وہی ہے جس نے جنگ احد میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کو دعوت مبارزت دی تھی اور مارا گیا تھا۔عتبہ بن غزوان کے آزاد کردہ خباب دوسری شخصیت ہیں جو بنونوفل بن عبدمناف کے حلیف تھے،انھوں نے بھی جنگ بدر میں حصہ لیا اوعہد فاروقی (۱۷ھ) میں پچپن سال کی عمر میں وفات پائی۔

ابوعبداللہ (یا ابو یحییٰ) حضرت خباب کی کنیت تھی۔انھیں بنوزہرہ سے بھی منسوب کیا جاتا ہے کیونکہ سباع بن عبدالعزی نے بنوزہرہ کے عوف بن عبدعوف (عبدالرحمان بن عوف کے والد) کے حلیف ہونے کا پیمان باندھ رکھا تھا۔ابن عبدالبر کہتے ہیں،نسب کے اعتبار سے خباب تمیمی،موالات (آقا و غلام کا رشتہ) کی نسبت سے خزاعی اور حلف کا تعلق رکھنے کی بنا پر زہری تھے۔حضرت خباب زمانۂ جاہلیت میں تلوار سازی کیا کرتے تھے،انھیں ام انمار نے مکہ کے ایک لوہار کی شاگردی میں دیا پھر اس کام کے لیے ایک دکان لے دی۔حضرت خباب 'السابقون الاولون' میں سے تھے،اپنے لڑکپن ہی میں وہ عربوں کی جہالت وضلالت سے بیزار تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بعثت محمدی کے

بالکل ابتدائی زمانے میں اسلام قبول کیا۔ دعوت حق قبول کرنے میں ان کا نمبر چھٹا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دار ارقم میں منتقل نہ ہوئے تھے۔ ابن اسحاق اس سے اختلاف کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے، حضرت خباب نے انیس سابقون کے بعد نعمت ایمان پائی اور بیس کا عدد مکمل کیا۔ حضرت ابوسلمہ، حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت ارقم بن ابوارقم، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت سعید بن زید، حضرت عُبید ہ بن حارث، حضرت نُعیم بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن جحش، حضرت جعفر بن ابو طالب اور حضرت صُہیب بن سنان نے بھی قریباً اسی زمانے میں اسلام قبول کیا جب حضرت خباب ایمان لائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جن اصحاب نے اپنے اسلام کا اعلان کیا، ان کے نام یہ ہیں، سیدنا ابوبکر، حضرت بلال، حضرت خباب، حضرت صہیب، حضرت عمار اور سمیہ (ام عمار)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابو طالب نے، حضرت ابوبکر کا ان کی قوم نے دفاع کیا جب کہ حضرت بلال، حضرت خباب، حضرت صہیب، سمیہ (ام عمار) اور عمار مستضعفین میں سے ہونے کی وجہ سے مشرکوں کی تعذیب کا خصوصی نشانہ بنے۔ انھیں لوہے کی زرہیں پہنا کر تپتی دھوپ میں بٹھا دیا جاتا۔ اسلام لانے کی پاداش میں مشرکین مکہ نے حضرت خباب پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے۔ وہ ان کا بدن ننگا کر کے تپتی زمین اور آگ کی طرح دہکتے ہوئے پتھروں پر لٹا دیتے۔ ان کا سر مروڑ دیتے اور منہ کے بل گھسیٹتے، وہ ہتھیلیوں سے اپنا چہرہ بچاتے لیکن مشرکوں کی ایک نہ مانتے، یہی کہتے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ دین حق لے کر آئے ہیں، تاکہ ہمیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے جائیں۔ حضرت خباب کہتے ہیں، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کی دیوار کے سائے میں چادر اوڑھے تشریف فرما تھے، ہم نے حاضر ہو کر کہا، آپ ہمارے لیے نصرت کی دعا کیوں نہیں مانگتے؟ آپ کا چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا، بیٹھے بیٹھے ارشاد فرمایا، تم سے پہلی امتوں کے اہل ایمان کو گڑھا کھود کر زمین میں گاڑ دیا گیا پھر آرا لے کر سر پر چلا دیا گیا لیکن وہ دین متین سے نہ ہٹے۔ لوہے کی کنگھیوں سے ہڈیوں تک ان کے گوشت اور اعصاب کو چھیل دیا گیا، یہ ظلم بھی انھیں راہ حق سے ہٹا نہ سکا۔ اللہ اس کار نبوت کا اتمام ضرور کرے گا حتیٰ کہ ایک سوار یمن کے مرکزی شہر صنعا سے ساحلی علاقے حضر موت تک جائے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہو گا۔ ہاں اسے بھیڑیوں سے اپنی بکریوں کی حفاظت کرنا ہو گی۔ تم ذرا جلد بازی کر رہے ہو۔ مکہ کے عہد ابتلا میں ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خباب سے ملنے آئے۔ ان کی مالکن ام انمار کو خبر ہوئی تو اس نے تپتا لوہا لے کر ان کے سر پر رکھ دیا۔ حضرت خباب نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شکایت کی تو تب آپ نے دعا فرمائی، اللہ! خباب کی مدد کر۔ تبھی ام انمار کو شدید سر درد کی شکایت

ہوئی، وہ درد کے مارے تڑپتی۔ اسے گرم لوہے سے سر داغنے کا علاج تجویز کیا گیا تو حضرت خباب ہی گرم لوہے سے اس کا سر داغتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں تشریف لاتے تو حضرت خباب، عمار، ابوفکیہہ (صفوان بن امیہ کے غلام) اور صہیب جیسے مسکین مسلمان آپ کے پاس آ کر بیٹھ جاتے۔ قریش کے متمردین ٹھٹھا کرتے اور کہتے، دیکھو! یہ ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی، یہی ہیں وہ لوگ جنھیں اللہ نے ہدایت و حق کے لیے ہمارے بیچ میں سے چن لیا ہے۔ اگر اس دعوت میں کوئی بھلائی ہوتی تو ہماری بجائے یہ لوگ اس کی طرف سبقت نہ کرتے۔

قدر احرار عرب نشناختہ باکلفتان حبش در ساختہ

۳ نبوی میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ جو کار نبوت آپ کو سونپا گیا ہے اسے پکارے لوگوں کے سامنے کہہ دیں۔ اس سے قبل جو تین سال گزرے، آپ صرف بھروسے کے آدمی کو دین کی دعوت دیتے تھے اور صحابہ مکہ کی گھاٹیوں میں چھپ چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عمار بن یاسر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت خباب بن ارت اور حضرت سعید بن زید ایک گھاٹی میں نماز ادا کر رہے تھے کہ ایک گروہ مشرکین آ دھمکا، ابوسفیان اور اخنس بن شریق بھی اس میں شامل تھے۔ مشرکوں نے مسلمانوں کو گالیاں دیں، برا بھلا کہا حتیٰ کہ جھگڑنے لگ گئے۔ قریب ہی اونٹ کی ران کی ہڈی پڑی تھی، سعد نے پکڑ کر ایک مشرک کے دے ماری۔ اس کا سر پھٹ گیا، کہا جاتا ہے، یہ تاریخ اسلام میں بہائے جانے والا پہلا خون تھا۔

حضرت خباب کہتے ہیں، میں نے مشرکوں کے سردار عاص بن وائل کو تلوار بنا کر دی، اس کی اجرت لینے گیا تو اس نے کہا، میں تلوار کی قیمت تب تک ادا نہ کروں گا جب تک تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار نہ کرے گا۔ میں نے کہا، میں ان کا انکار اس وقت تک نہ کروں گا جب تک تو مر نہ جائے اور تمہارا حشر نہ ہو جائے۔ کہنے لگا، کیا میں موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے کھڑا کر دیا جاؤں گا؟ تمھارے صاحب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کے دین کے تم پیرو ہو، دعویٰ کرتے ہیں کہ جنت جانے والے سونا، چاندی، لباس، خدم و حشم جو چاہیں گے، ملے گا؟ حضرت خباب نے کہا، ہاں! عاص نے کہا، تب تو مجھے روز قیامت تک مہلت دو، میں جنت میں جا کر تمہارا حق دے دوں گا۔ خباب! بخدا، تم اور تمھارے صاحب وہاں بھی اللہ کے نزدیک مجھ سے زیادہ بااثر اور صاحب قسمت نہ ہوں گے۔ اس موقع پر سورۂ مریم کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ کَفَرَ بِاٰیٰتِنَا وَ قَالَ ''بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیات

لَأُوتَيَنَّ مَالاً وَ وَلَداً. اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْداً . كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَه‘ مِنَ الْعَذَابِ مَدّاً. وَّ نَرِثُه‘ مَا يَقُولُ وَيَاْتِينَا فَرْداً.

(بخاری:۴۷۳۵)

کا انکار کیا اور کہا، (اگر میں دوبارہ زندہ ہوا تو بھی) یہی مال واولاد مجھے (وہاں) ملے گا؟ کیا اس نے غیب کی خبر پا لی ہے یا خدائے رحمان کے یہاں سے عہد لے لیا ہے؟ ہر گز نہیں، یہ جو کچھ کہہ رہا ہے ہم اسے لکھ لیں گے اور اس کا عذاب بڑھاتے جائیں گے۔ (اپنے مال واولاد کے بارے میں) جو یہ حق جتلا رہا ہے ہم ہی ان کے وارث ہوں گے اور یہ اکیلا ہی ہمارے سامنے حاضر ہوگا۔‘‘

حضرت خباب بن ارت نے قرآن مجید کا، تب تک نازل ہونے والا حصہ خوب حفظ کر لیا تھا، وہ اس کے معانی و معارف سے بھی خوب آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نئے دین حق میں شامل ہونے والوں کو اس کی تعلیم دیا کرتے۔ حضرت عمر بن خطاب اس وقت تک دشمنان اسلام کی صفوں میں تھے۔ ان کی بہن فاطمہ نے اسلام قبول کیا تو حضرت خباب انھیں قرآن پڑھانے جاتے۔ فاطمہ، سعید بن زید سے بیاہی ہوئی تھیں۔ ایک روز جب رسول اکرم اور صحابہ دار ارقم میں جمع تھے، سیدنا عمر ان سب کو ختم کرنے کے ارادہ سے گلے میں تلوار لٹکا کر نکلے۔ راستے میں حضرت نُعیم بن عبداللہ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا، کہاں جاتے ہو؟ اپنے گھر والوں کی خبر تو لو، تمھاری بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید مسلمان ہو چکے ہیں۔ سیدنا عمر پلٹے، اپنی بہن کے گھر پہنچے جہاں حضرت خباب بن ارت میاں بیوی کو قرآن پاک کی تعلیم دے رہے تھے۔ سیدنا عمر کے قدموں کی آہٹ سن کر حضرت خباب چھپ گئے۔ فاطمہ نے قرآن کے اوراق چھپا لیے لیکن سیدنا عمر نے جو حضرت خباب کی آواز سن چکے تھے پوچھا، یہ کیا سرگوشیاں ہو رہی تھیں؟ انھوں نے پوچھا، کیا آپ نے ہمیں کچھ پڑھتے ہوئے سنا ہے؟ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو ہو چکے ہیں اور قرآن پڑھ رہے تھے۔ سیدنا عمر نے پہلے تو اپنے بہنوئی کا گریبان پکڑا اور بہن کا سر پھاڑا پھر نادم ہو کر کہا، مجھے وہ صحیفہ تو دو، میں بھی دیکھوں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کس بات کی تعلیم دیتے ہیں؟ بہن کے کہنے پر انھوں نے غسل کیا اور اوراق وحی پر درج سورۂ طٰہٰ پڑھنی شروع کر دی۔ جوں جوں پڑھتے گئے توں توں ان کی دنیا بدلتی گئی اور وہ آمادہ بہ ایمان ہو گئے۔ حضرت خباب جو چھپے ہوئے تھے، باہر نکل آئے اور کہا، عمر! مجھے پوری امید ہے کہ اللہ نے تمھیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول کرتے ہوئے دین اسلام کے لیے چن لیا ہے۔ کل جمعرات کی شب ہی آپ دعا فرما رہے تھے، اللہ! عمر بن خطاب یا ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) کے ذریعے اسلام کو مضبوط کر۔ سیدنا عمر نے کہا، خباب مجھے محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کے پاس لے جاؤ۔ تب حضرت خباب انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دارارقم لے گئے اور وہ نعمت ایمان سے سرفراز ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ہجرت کا اذن دیا تو حضرت خباب بھی مہاجرین کی صف میں شامل ہو گئے۔ وہ مسطح بن اثاثہ اور بنومطلب بن عبدمناف کے کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ مدینہ روانہ ہوئے اور بنوعجلان کے ہاں قبا میں قیام کیا۔ پھر وہ کلثوم بن ہدم کے مہمان ہوئے اور جنگ بدر سے کچھ پہلے ان کی وفات تک وہیں مقیم رہے۔ کلثوم ہجرت نبوی سے قبل ایمان لا چکے تھے، انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابوعبیدہ بن جراح، مقداد بن اسود اور کچھ دوسرے صحابہ کی مہمانی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ کلثوم کے بعد خباب اور مقداد، سعد بن عبادہ کے ہاں منتقل ہو گئے اور بنوقریظہ کی فتح تک انھی کے ہاں رہے۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبر بن عتیک یا خراش بن صمہ کے آزاد کردہ تمیم کے ساتھ حضرت خباب کی مواخات قائم فرمائی۔

حضرت خباب نے جنگ بدر اور تمام معرکوں میں حصہ لیا۔ جنگ احد میں ان کی آنکھوں کے سامنے سباع بن عبدالعزیٰ جہنم واصل ہوا جو ان کی مالکن ام انمار کا بھائی تھا۔ اسے سید الشہدا حمزہ نے انجام تک پہنچایا۔ حضرت خباب کی بیٹی روایت کرتی ہیں، حضرت خباب ایک سریہ میں گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر آتے اور ہماری ضروریات کا خیال رکھتے حتیٰ کہ بکری کا دودھ بھی دوہ دیتے۔ ہمارا برتن لبا لب بھر جاتا اور دودھ بہنے کو ہوتا۔ حضرت خباب لوٹے اور دودھ دوہا تو وہ کم ہو کر پہلے جتنا ہو گیا۔

حضرت خباب کہتے ہیں، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور شکایت کی، ہمیں سخت گرمی میں ظہر کی نماز پڑھنا پڑتی ہے (لہٰذا ظہر کا وقت کچھ مؤخر کر دیا جائے)۔ آپ نے نماز کو تاخیر سے پڑھنا منظور نہ فرمایا۔ شبیر احمد عثمانی کہتے ہیں، شاید حضرت خباب ظہر کو (پہلے سے حاصل تاخیر کی سہولت سے) مزید مؤخر کروانا چاہتے تھے اس لیے آپ نے اجازت عطا نہ فرمائی۔ مزید کہتے ہیں، یہ بات نہ ہو تو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ''اذا اشتد الحر فابردوا بالصلاۃ فان شدۃ الحر من فیح جھنم۔ جب گرمی کی شدت زیادہ ہو جائے تو ظہر کی نماز ٹھنڈے وقت میں ادا کرو کیونکہ گرمی کی سختی دوزخ کے سانس کی مانند ہے نے آپ کے ظہر اول وقت ہی میں ادا کرنے اور تاخیر کی اجازت نہ دینے کے اس فرمان کو منسوخ کر دیا۔ حضرت خباب کا واقعہ پہلے وقوع پذیر ہوا اور 'ابراد بالظھر' (ظہر ٹھنڈے وقت میں پڑھنا) کا حکم بعد میں صادر ہوا۔

حضرت خباب بن ارت بیان کرتے ہیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک بار) عشاء کی نماز خوب طویل

پڑھائی، لگتا تھا رات اسی میں بیت جائے گی۔ صحابہ نے کہا، یا رسول اللہ! آپ نے (پہلے) ایسی نماز نہ پڑھائی تھی؟ جواب فرمایا، ہاں! یہ انابت وخشیت کی نماز تھی۔ میں نے اس میں اللہ سے تین التجائیں کیں۔ اس نے دو مان لیں اور ایک سے منع کر دیا۔ میں نے دعا مانگی کہ میری امت قحط سے ہلاک نہ ہو، اللہ نے قبول کر لی۔ میں نے سوال کیا، مسلمانوں پر کوئی دوسرا دشمن مسلط نہ ہو جائے، اللہ نے مان لیا۔ میں نے التجا کی کہ اہل اسلام فرقوں میں بٹ کر ایک دوسرے پر جبر وتشدد نہ کرنے لگیں، اللہ نے اس سے منع کر دیا۔

ایک بار بنو تمیم کے سردار اقرع بن حابس اور بنو فزارہ کے لیڈر عیینہ بن حصن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئے۔ حضرت صہیب، حضرت بلال، حضرت عمار، حضرت خباب اور کچھ دوسرے غریب ومسکین اہل ایمان آپ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان غربا کو نظر حقارت سے دیکھا اور آپ کو الگ لے جا کر کہا، ہم چاہتے ہیں، آپ ہمارے لیے ایسی نشست ترتیب دیں جس سے عربوں کو ہماری فضیلت کا احساس ہو۔ آپ کے پاس عربوں کے وفد آ رہے ہیں، ہم نہیں چاہتے، وہ لوگ ہمیں ان غلاموں کی معیت میں دیکھیں۔ ہم آئیں تو آپ ان کے پاس سے اٹھ جائیں اور جب ہم فارغ ہو جائیں تو آپ چاہیں تو ان کے پاس بیٹھ جائیں۔ آپ نے اس وقت ہامی بھر لی تو ان لوگوں نے تحریر کرنے کو کہا۔ آپ نے کاغذ منگوا کر علی کو لکھنے کا کہا۔ اسی دوران میں جبریل علیہ السلام وحی لے کر نازل ہو گئے،

وَلَاتَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ، مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ. (سورۂ انعام ۶: ۵۲)

”(اے نبی!) ان لوگوں کو نہ دھتکاریے جو اپنے رب کی خوشنودی چاہنے کے لیے صبح و شام اسے پکارتے ہیں۔ ان کے اعمال کے حساب میں سے آپ پر کچھ عائد نہیں ہوتا اور آپ کے اسوۂ حسنہ کے حساب کی ان پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کو دھتکار کر آپ ظالموں میں سے ہو جائیں۔“

حضرت خباب کہتے ہیں، اس کے بعد ہم آپ کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھتے۔ آپ خود تشریف لے جاتے تو ہم آتے۔

علقمہ روایت کرتے ہیں، ہم عبداللہ بن مسعود کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت خباب بن ارت آئے اور کہا، اے ابوعبدالرحمان (ابن مسعود کی کنیت)! کیا یہ نوجوان بھی ویسی تلاوت کر سکتے ہیں جیسی آپ کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا، آپ چاہیں تو ان میں سے کسی کو تلاوت کرنے کو کہہ سکتے ہیں۔ تب حضرت خباب نے کہا، علقمہ! تم تلاوت

کرو۔علقمہ کہتے ہیں، میں نے سورۂ مریم کی پچاس آیتیں تلاوت کیں۔عبداللہ بن مسعود نے حضرت خباب سے پوچھا، کیا خیال ہے؟انھوں نے کہا،خوب تلاوت کی ہے۔حضرت خباب کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی تھی،عبداللہ نے کہا، کیااس انگوٹھی کے پھینکنے کا وقت نہیں آیا؟ حضرت خباب نے کہا،آج کے بعد آپ میرے ہاتھ پر اسے نہ دیکھیں گے۔

ایک دفعہ حضرت خباب بن ارت عبداللہ بن عمر کے پاس گئے اور پوچھا،کیا آپ نے ابو ہریرہ کی روایت سنی ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے،جو مسلمان اپنے گھر سے کسی جنازے کے ساتھ نکلا،نماز جنازہ پڑھنے کے بعد میت کے ساتھ گیا اور تدفین تک اس کے ساتھ رہا،اسے دو قیراط سونے جتنا اجر ملے گا،ہر قیراط احد پہاڑ جتنا ہو گا۔جو شخص نماز جنازہ پڑھنے کے بعد لوٹ آیا،اسے احد پہاڑ سونے جتنا اجر (یعنی ایک قیراط) ملے گا۔عبداللہ بن عمر نے حضرت خباب کو سیدہ عائشہ کی طرف بھیج دیا کہ ان سے حدیث کی بابت پوچھ کر مجھے بھی بتائیں۔وہ گئے تو مسجد کے اندر سے کنکریوں کی مٹھی بھر لی اور (بے کلی سے) اسے الٹنے پلٹنے لگے۔حضرت خباب لوٹے اور بتایا،سیدہ عائشہ نے بتایا ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ کا کہنا سچ ہے۔عبداللہ نے ہاتھ سے کنکریاں پھینک دیں اور (حسرت سے) کہا،ہم نے بے شمار قیراطوں کی کوتاہی کر ڈالی۔(یعنی کئی جنازوں میں شرکت نہ کر کے اس ثواب سے محروم رہ گئے)

عہد فاروقی میں جب کوفہ کی بنا پڑی،دوسرے صحابہ کی طرح حضرت خباب کو بھی ایک قطعۂ زمین ملا اور وہ وہاں مقیم ہو گئے۔کہا جاتا ہے،کوفہ کی پہلی اینٹ حضرت خباب بن ارت اور حضرت عبداللہ بن مسعود نے لگائی۔شعبی بیان کرتے ہیں،ایک بار حضرت خباب سیدنا عمر سے ملنے آئے،عمر نے ان کو اپنا تکیہ دے کر بٹھایا اور کہا،روئے زمین پر ایک ہی شخص اس نشست کا حق دار ہے۔حضرت خباب نے پوچھا،امیر المومنین! کون؟ جواب دیا،بلال۔حضرت خباب نے کہا،یا امیر المومنین!وہ مجھ سے زیادہ حق نہیں رکھتے۔کچھ لوگ تھے جنھوں نے اللہ کی توفیق سے حضرت بلال کو مشرکین مکہ سے بچالیا۔میرا تو دفاع کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ایک روز مشرکوں نے مجھے پکڑا اور آگ لگا کر اس میں جھلسانے اور گھسیٹنے لگے۔ایک کافر نے اپنا پاؤں میرے سینے پر رکھ دیا،جلتی زمین پر کمر ٹکانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔میری کمر کی چربی نے پگھل کر اس آگ کو ٹھنڈا کیا۔حضرت خباب نے کپڑا ہٹا کر اپنی کمر دکھائی جو جلنے سے رنگت کھو بیٹھی تھی اور نمایاں سفید داغ اس میں نظر آرہے تھے۔ابولیلیٰ کندی کی روایت میں بعینہٖ یہی واقعہ بلال کی بجائے عمار بن یاسر کے ذکر سے بیان ہوا ہے۔

ابو خالد کہتے ہیں،ہم لوگ مسجد میں تھے کہ حضرت خباب آئے اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔لوگوں نے کہا،ہم آپ

سے ملنے آئے ہیں۔ ہمیں کچھ بتائیں یا نصیحت کریں۔ انھوں نے کہا، میں تمھیں کیا مشورہ دوں اور کیسے وہ کچھ کرنے کو کہوں جو میں خود نہیں کرتا؟

حضرت خباب بن ارتؓ کی وفات ۳۷ھ میں ۶۳ (یا ۷۳) برس کی عمر میں ہوئی۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے جنگ صِفّین اور جنگ نہروان میں حضرت علی کا ساتھ دیا اور ۳۹ھ میں جنگ صِفّین میں شہید ہوئے۔ ان کا جنازہ حضرت علی نے پڑھایا۔ لیکن مشہور یہی ہے کہ وہ شدید بیمار پڑے اور حضرت علی کے کوفہ آنے سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ حارثہ بن مضرب، قیس بن ابوحازم اور کچھ اور علما حضرت خباب کی عیادت کرنے آئے اور کہا، ابوعبداللہ! بشارت ہو، آپ کے بھائی ہیں جن سے کل آپ حوض کوثر پر ملاقات کریں گے۔

غداً تلقی الاحبة　　محمداً و حزبه

(کل تم دوستوں سے ملو گے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں سے)

حضرت خباب رونے لگے اور کہا، مجھے کوئی گھبراہٹ نہیں لیکن جن لوگوں کا تم نے ذکر کر کے انھیں میرے بھائی قرار دیا ہے وہ چلے گئے اور دنیا سے کچھ حاصل نہ کیا۔ ہمارے لیے تو اس دنیا کے ثمرات خوب پکے اور ہم نے ان سے حظ اٹھایا۔ ان کے پیٹ پر (اس زمانے کے طریقۂ علاج کے مطابق آگ سے) سات داغ لگائے جا چکے تھے۔ کہا، ہمارے وہ ساتھی جو گزر چکے ہیں، اس حال میں گئے کہ دنیا انھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکی (یعنی ان کا اجر آخرت کم نہ کر سکی)۔ ہمیں جو مال ملا، اسے انفاق کرنے کے لیے کوئی انسان نہیں ملتا، مٹی ہی رہ گئی ہے جس پر یہ خرچ کیا جا سکتا ہے (یعنی تعمیرات کی جا سکتی ہیں)۔ (حضرت خباب نے جو بیماری سے سخت تنگ آئے ہوئے تھے، مزید کہا) اگر ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کی دعا کرنے سے منع نہ کیا ہوتا تو میں ضرور مرنے کی دعا مانگتا۔ راوی حدیث قیس کہتے ہیں، ایک بار پھر ہم ان سے ملنے گئے، وہ اپنے گھر کی دیوار تعمیر کر رہے تھے۔ فرمایا، مسلمان کو ہر مال میں اجر ملتا ہے جو وہ خرچ کرتا ہے مگر اس میں نہیں جو وہ (بلاوجہ) مٹی پر لگا دیتا ہے۔

حضرت خباب کو ان کا مصر کا بنا ہوا قباطی کفن دکھایا گیا تو وہ رو پڑے اور کہنے لگے، ''ہم نے اللہ کی رضا جوئی کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی تو ہمارا اجر اللہ کے ذمے ہو گیا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے کچھ تھے جو فوت ہوئے اور اپنے اجر میں سے کچھ نہ کھا سکے (یعنی زمانۂ فتوحات پایا نہ مال غنیمت حاصل کر سکے)۔ ان میں سے ایک مصعب بن عمیر تھے جو جنگ احد میں شہید ہوئے، انھیں کفنانے کے لیے ہمیں ایک ہی دھاری دار چادر ملی۔ سر ڈھانکتے تو پاؤں باہر نکل آتے، جب پاؤں ڈھانپتے، سر کفن سے باہر ہو جاتا۔ آخر کار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

ہمیں حکم دیا کہ ان کا سر کفن کے اندر کر دیں اور پاؤں پر اذخر گھاس رکھ دیں۔ کچھ ساتھی تھے جن کے پھل پک گئے، انھوں نے توڑے (اور کھائے یعنی غنائم حاصل کیں)۔''

ابن حجر کہتے ہیں، ابوذر غفاری ان صحابہ کی مثال ہیں جو غنائم حاصل کرنے کے باوجود پہلی حالت فقر پر قائم رہے۔ دوسری قسم ان جاں نثاران رسول کی ہے جنھوں نے مال غنیمت کو اپنا لباس اور رہن سہن بہتر کرنے میں صرف کیا، عبداللہ بن عمر اس زمرہ میں آتے ہیں۔ عبدالرحمان بن عوف ان اصحاب کی نمائندگی کرتے ہیں جنھوں نے اموال غنیمت کاروبار میں لگا کر مزید دولت کمائی اور پھر دل کھول کر انفاق کیا۔ حضرت خباب کا اشارہ دوسری اور تیسری قسم کے صحابہ کی طرف ہے۔

ترمذی کی روایت اس طرح ہے، حضرت حارثہ بن مضرب حضرت خباب بن ارت کی عیادت کے لیے آئے، ان کے پیٹ پر آگ سے داغ لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا، مجھے علم نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کسی پر (دولت کی) وہ آزمائش آئی ہے جس کا مجھے سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ عہد نبوی میں میرے پاس ایک درہم نہ ہوتا تھا اور اب میرے اس گھر کے کونے میں ایک صندوق (تابوت) پڑا ہے جس میں چالیس ہزار کھرے دینار پڑے ہیں۔ حضرت خباب نے اس صندوق پر کوئی تالا لگایا نہ کسی سوالی کو جواب دیا پھر بھی اس قدر خشیت طاری تھی کہ کہا، مجھے خوف ہے کہ ہماری نعمتیں (طیبات) ہمیں دنیا کی زندگی ہی میں دے دی گئی ہیں۔ ان کا اشارہ اس فرمان خداوندی کی طرف تھا کہ روز قیامت کفار کو جہنم میں ڈالنے سے پہلے کہا جائے گا،

اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا، فَالۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡهُوۡنِ بِمَا كُنۡتُمۡ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ وَبِمَا كُنۡتُمۡ تَفۡسُقُوۡنَ. (سورۂ احقاف: ۲۰)

''تم اپنی دنیاوی زندگی میں لذتیں حاصل کر چکے اور ان سے لطف اندوز ہو چکے ہو۔ آج تمھیں عذاب ذلت کا بدلہ دیا جائے گا کیونکہ تم زمین میں ناحق اکڑا کرتے اور فسق و فجور کیا کرتے تھے۔''

حضرت علی کوفہ پہنچے تو شہر سے باہر سات (یا آٹھ) قبریں دیکھیں، پوچھا، یہ کس کی ہیں؟ انھیں بتایا گیا، آپ کے جانے کے بعد حضرت خباب نے وفات پائی اور وصیت کی کہ انھیں کوفہ کے باہر دفنایا جائے۔ پہلی قبر ان کی ہے، باقی لوگوں کی تدفین بعد میں ہوئی۔ سیدنا علی نے ان کے لیے دعا کی، اللہ خباب پر رحم کرے، انھوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا، خوش دلی سے ہجرت کی، جہاد کرتے ہوئے زندگی بسر کی اور کئی جسمانی تکلیفیں اٹھائیں۔ اللہ نیک عمل

کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہ کرے گا۔ پھر فرمایا، اے دیار خموشاں کے رہنے والو اور ویران جگہ بسنے والے اہل ایمان اور مسلمان مرد و عورتو! السلام علیکم، تم ہم سے پہلے آگے جا چکے ہو۔ ہم تمھارے پیچھے پیچھے، جلد تم سے آ ملنے والے ہیں۔ اے اللہ! ہماری اور ان کی مغفرت کر، اپنا عفو کر کے ہم سے اور ان سے درگزر کر۔ خوش ہو وہ شخص جس نے آخرت کو یاد رکھا، روز حساب کے لیے عمل کیا اور تھوڑی روزی پر قناعت کر لی۔

حضرت خباب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی۔ مکررات کو شامل کر کے بتیس احادیث ان سے مروی ہیں، ان میں سے دو بخاری میں اور ایک مسلم میں ہے۔ ان سے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں، ان کے بیٹے عبداللہ بن خباب، ابوامامہ، شقیق بن سلمہ (ابووائل)، عبداللہ بن ابوہذیل، عبداللہ بن سخبرہ (ابومعمر)، ابومیسرہ، قیس بن ابوحازم، مسروق، حارثہ بن مضرب، علقمہ بن قیس، شعبی اور عمرو بن شرحبیل۔ ابومعمر (عبداللہ بن سخبرہ) کہتے ہیں، ہم نے خباب سے پوچھا، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر و عصر کی نمازوں میں تلاوت کیا کرتے تھے؟ انھوں نے کہا، ہاں۔ پوچھا، آپ کو کیسے پتا چلتا تھا؟ بتایا، آپ کی ریش مبارک کے ہلنے سے۔

حضرت خباب کے بیٹے عبداللہ کو حضرت علی کے عہد خلافت میں خوارج نے قتل کر دیا۔ خوارج ان کے قصبے میں آئے تو وہ خوف زدہ ہو کر باہر نکلے۔ خوارج نے کہا، اپنے باپ کی روایت کردہ کوئی حدیث سناؤ۔ عبداللہ نے یہ ارشاد نبوی سنایا، ''ایک فتنہ ایسا آئے جس میں بیٹھا ہوا کھڑے ہوئے سے بہتر ہو گا، کھڑا ہوا چلنے والے سے بہتر ہو گا اور چلنے والا دوڑنے والے کے بہ نسبت بہتر ہو گا۔'' خوارج نے کہا، تم نے یہ زمانہ پا لیا ہے، اب عبداللہ مقتول بن جاؤ۔ یہ کہہ کر انھیں دریا کنارے لے گئے اور گردن اڑا دی۔

مطالعۂ مزید: الجامع المسند الصحیح (بخاری، شرکۃ دارالارقم)، المسند الصحیح المختصر من السنن (مسلم، شرکۃ دارالارقم)، السیرۃ النبویہ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (ابن اثیر)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر (ابن خلدون)، البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)، الاصابہ فی تمییز الصحابہ (ابن حجر)، فتح الباری (ابن حجر)، صور من حیاۃ الصحابہ (عبدالرحمان رافت پاشا)

محمد عمار خان ناصر

خواتین کے حقوق اور مسائل

[جدید تعلیم یافتہ خواتین کی ایک نشست میں کی
جانے والی گفتگو، مناسب ترمیم و اضافہ کے ساتھ]

مجھ سے فرمائش یہ کی گئی ہے کہ قرآن مجید میں اور اسلامی شریعت میں مردوں اور خواتین کے مابین امتیاز پر مبنی جو بعض احکام ہیں، ان کے حوالے سے دین کا زاویہ نگاہ اور ان کی تعبیر وتشریح کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر میں آپ کے سامنے رکھوں اور پھر اس پر مبنی جو سوالات ہوں، ان پر کچھ گفتگو کی جائے۔

یہ موضوع اس لحاظ سے تھوڑا مشکل ہے کہ ایک طرف اس بات کو ملحوظ رکھنا دین کے طالب علم کی ذمہ داری ہے کہ قرآن وسنت میں جو بات جس طرح سے بیان کی گئی ہے، اس کی اصل اسپرٹ کو اور اس کے بیان کے جتنے لوازمات ہیں، ان کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھا جائے اور قرآن وسنت سے جس طرح بات سمجھی گئی ہے، اس کو اسی طرح بیان کیا جائے اور دوسری طرف بہرحال یہ مشکل بھی ہے کہ دین کے کچھ احکام میں مردوں اور عورتوں کے مابین جو ایک امتیاز روا رکھا گیا ہے اور بعض چیزوں میں لگتا ہے کہ عورت کو نسبتاً کم درجہ دیا گیا ہے، اس کے حوالے سے ایک حساسیت (sensitivity) ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ خواتین اس پہلو سے اپنے ذہن میں اشکال محسوس کرتی ہیں اور ان کے محسوسات ان احکام سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ تو دین کا پیغام پہنچانے یا دین کی تفہیم کے کام میں اس بات کو بھی بہرحال ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مخاطب دین سے نفور محسوس کرنے کے بجائے اس کی طرف مائل ہو اور اس کی ہدایات کو قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ بہرحال میں اس کی پوری کوشش کروں گا کہ اپنے فہم کے لحاظ سے ان دونوں چیزوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی بات بیان کروں۔

اس بحث کو ہم اختصار کے ساتھ تین چار نکات میں تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا واقعی ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب مرد اور عورت کو پیدا کیا اور اس دنیا میں ان کی تخلیق کا ایک نقشہ بنایا اور پھر ان کو دین و شریعت کی صورت میں متعین ہدایات دیں تو ایک ہی نوع کی ان دو صنفوں میں تفاوت اور امتیاز کو ملحوظ رکھا؟

یہ سوال اصل میں اس پہلو سے پیدا ہوتا ہے کہ دور جدید میں بہت سے اہل فکر نے شریعت کے ان احکام کو جن میں بظاہر امتیاز کو ملحوظ رکھا گیا ہے، ایک دوسرے طریقے سے interpret کرنے کی کوشش کی ہے اور اس زاویے سے ان کی تفہیم کی کوشش کی ہے کہ ان احکام میں فی الحقیقت امتیاز نہیں برتا گیا اور ان کے بارے میں اب تک جو بات سمجھی گئی ہے، وہ ٹھیک نہیں سمجھی گئی۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ ان آیات اور احادیث کی تشریح میں اس سے پہلے کا جو ایک عمومی سماجی رویہ تھا اور جو لوگوں کی ایک mentality تھی، وہ زیادہ اثر انداز ہوئی ہے، ورنہ اگر قرآن و سنت کو خارجی اثرات سے آزاد ہو کر پڑھا جائے تو ایک دوسرے طریقے سے ان احکام کی تعبیر و تشریح کرنا ممکن ہے۔

یہاں ان متبادل تعبیرات کو زیر بحث لا کر گفتگو کرنے سے تو شاید بات لمبی ہو جائے گی۔ میں اس کے بارے میں اپنا اصولی نقطۂ نظر بیان کر دیتا ہوں۔ میرے خیال میں قرآن مجید کی آیات اور متعلقہ احادیث کا غیر جانب داری سے جتنا بھی مطالعہ کیا جائے اور اپنے احساسات سے، اپنے ذہنی پس منظر اور اپنے فکری رجحانات سے جتنا بھی مجرد ہو کر انھیں سمجھنے کی کوشش کی جائے، یہ بات ماننے بغیر کوئی چارہ دکھائی نہیں دیتا کہ بہر حال کچھ چیزوں میں مردوں اور عورتوں کے مابین مرتبے اور درجے کا فرق ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس فرق کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت بھی کی گئی ہے۔ چنانچہ بحث کا پہلا نکتہ جس کی روشنی میں ہم آگے بڑھ سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اس بات کو ایک بنیادی مفروضے کے طور پر مان لینا چاہیے، اس لیے کہ میرے فہم کے لحاظ سے ان نصوص کی کوئی مختلف تعبیر کرنے میں خاصی کھینچا تانی کرنی پڑتی ہے۔ کلام کو سمجھنے کے جتنے سادہ طریقے ہیں، جتنے سادہ اصول ہیں جن پر ہم سارے دین کو سمجھتے ہیں، آپس میں ایک دوسرے کی بات کو سمجھتے ہیں اور جن طریقوں سے ہر انسانی زبان میں اپنی بات کا ابلاغ کیا جاتا ہے، ان سارے اصولوں کی روشنی میں یہی بات زیادہ درست دکھائی دیتی ہے کہ متعلقہ آیات اور احادیث میں فی الواقع یہ فرق قائم کیا گیا ہے۔

اس کی دو مثالیں بہت نمایاں ہیں۔ باقی احکام ان کے ضمن میں آ جائیں گے، لیکن دو چیزیں ہیں جو بہت واضح طریقے سے اس فرق کو بیان کرتی ہیں۔ ایک تو سورۂ نساء کی وہ آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے شوہروں اور بیویوں کے حقوق اور فرائض کا ذکر کیا اور شوہروں کا مرتبہ اور ان کے اختیارات بیان کیے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَاللاَّتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلاَ تَبْغُواْ عَلَيْهِنَّ سَبِيلاً إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيّاً كَبِيراً. (النساء۴: ۳۴)

”شوہر بیویوں پر حاکم ہیں، کیونکہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔ سو نیک بیویاں وہ ہیں جو فرماں بردار ہوں اور رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوں، کیونکہ اللہ نے بھی رازوں کی حفاظت کی ہے۔ اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو، ان کو نصیحت کرو، انھیں بستروں میں الگ کر دو اور انھیں جسمانی سزا دو۔ پھر اگر وہ تمھاری مطیع ہو جائیں تو ان پر (دست درازی کی) راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک اللہ بہت بلند اور بہت بڑا ہے۔“

یہاں آپ سادہ طریقے سے متن کو پڑھیں تو اس کے مندرجات اور اس کا ایک ایک لفظ صاف بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نکاح کے رشتے میں یہ چاہتے ہیں کہ مرد ایک بالا دست شریک کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرے، جبکہ عورت اس کے سامنے فرماں برداری کا رویہ اختیار کرے اور اگر اس کی طرف سے سرکشی کا رویہ سامنے آئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شوہر کو مناسب جسمانی تادیب کا اختیار بھی حاصل ہے۔

اسی طرح سے جہاں طلاق کا معاملہ بیان ہوا ہے، وہاں بھی صاف الفاظ میں یہ کہا گیا ہے کہ طلاق کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے مرد کو ایک درجہ زیادہ دیا ہے: ’وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ‘ (البقرہ ۲: ۲۲۸) یعنی یہ کہ وہ طلاق دے سکتا ہے، جبکہ عورت براہ راست طلاق نہیں دے سکتی۔ مرد طلاق دینے کے بعد چاہے تو عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے اور دو مرتبہ تک اس کو یہ اختیار حاصل ہے۔ رشتۂ نکاح میں مرد کی ایک درجہ فوقیت کے حوالے سے یہ ہدایت بھی بالکل واضح ہے جس کو توڑ موڑ کر کسی اور تعبیری سانچے میں فٹ نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن رشتۂ نکاح میں مرد کو ایک درجہ فوقیت دیتا ہے، اس کے حقوق زیادہ بیان کرتا ہے، اس کے اختیارات زیادہ بیان کرتا ہے اور عورت سے یہ کہتا ہے کہ وہ اس رشتے میں اطاعت کا رویہ اختیار کرتے ہوئے اور شوہر کی جو بالادستی بیان ہوئی ہے، اس کو قبول کرتے ہوئے اس رشتے کو نبھائے۔

دوسری چیز جو خود قرآن کے نصوص میں بیان ہوئی ہے، وہ وراثت کے حصے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اولاد کے حصے، ماں باپ کے حصے، میاں بیوی کے حصے اور بہن بھائی کے حصے بیان کیے ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ

وراثت کے حصوں کی یہ تقسیم اللہ تعالیٰ نے قرب منفعت کے اصول پر کی ہے۔ یعنی چونکہ انسان خود انصاف سے یہ متعین نہیں کر سکتے کہ کس رشتے سے ان کو کتنی منفعت حاصل ہوتی ہے اور اس کے لحاظ سے جب مرنے کے بعد کسی شخص کا ترکہ تقسیم ہو تو کس رشتہ دار کو کس تناسب سے حصہ ملنا چاہیے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انتہائی قریبی رشتے داروں یعنی ماں باپ، اولاد، میاں بیوی اور بہن بھائی کے حصے از خود طے کر دیے ہیں۔ یہاں بھی قرآن نے بیشتر صورتوں میں مرد اور عورت کے حصوں میں فرق روا رکھا ہے۔ مثال کے طور پر اگر مرنے والے کے اولاد ہے تو ترکہ اس لحاظ سے تقسیم کیا جائے گا کہ خواتین کو مرد وارثوں سے نصف حصہ ملے گا۔ اسی طرح اگر اولاد میں صرف لڑکے ہیں تو سارا مال ان کو مل جائے گا، لیکن اگر صرف خواتین ہیں تو سارا مال ان کو نہیں ملے گا، بلکہ اکیلی لڑکی کو نصف جبکہ دو یا دو سے زیادہ لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا۔

ماں باپ کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہے۔ ایک صورت میں تو قرآن دونوں کا حصہ برابر بیان کرتا ہے، یعنی اگر مرنے والے کے اولاد ہے تو باپ کا بھی چھٹا حصہ ہے اور ماں کا بھی، لیکن اگر اولاد نہیں ہے اور ماں باپ ہی وارث ہیں تو وہاں پر پھر یہ تفریق آ جاتی ہے کہ تیسرا حصہ ماں کو ملے گا اور باقی دو تہائی باپ کو۔

ان کے علاوہ اور بہت سی نصوص ہیں، احادیث ہیں جن میں شاید کسی حد تک بحث کی گنجائش نکلتی ہے کہ کیا وہاں واقعی مرد اور عورت کے مابین کوئی فرق بیان کیا گیا ہے یا نہیں، لیکن قرآن مجید کے یہ جو دو تین مقامات ہیں، ان میں اس بات کا انکار بہت مشکل ہے کہ قرآن واقعی ان معاملات میں فرق روا کرتا ہے۔ اس لیے قرآن نے جیسے بات کہی ہے، اس کو ویسے ہی سمجھنا چاہیے اور ویسے ہی بیان کرنا چاہیے۔

اس کے بعد اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرق اللہ نے کیوں روا رکھا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نظر میں مرد، عورت کے مقابلے میں زیادہ برتر مخلوق ہے اور عورت اس کی نظر میں کوئی حقیر اور کم تر مخلوق ہے یا اس سے مختلف کوئی بات اس معاملے میں کہی جا سکتی ہے؟ قرآن مجید اور شریعت کی تعلیمات کا جو پورا نظام فکر ہے، اس کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ یعنی بعض چیزوں میں جو فرق قائم کیا گیا ہے اور مرتبے کا ایک فرق ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے، وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اللہ نے مرد کو تو اس حیثیت سے پیدا کیا ہے کہ وہ خدا کی نظر میں ایک برتر مخلوق ہے اور عورت کو اس حیثیت سے پیدا کیا ہے کہ وہ ایک کم تر مخلوق ہے اور حیثیت کی اس برتری اور کم تری کو واضح کرنے کے لیے اللہ نے احکام میں یہ فرق کیا ہے۔ آپ جتنا بھی مطالعہ کریں، میرے فہم کی حد تک قرآن و سنت کی مجموعی تعلیمات سے اللہ تعالیٰ کا یہ attitude سامنے نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ اس معاملے کو جس زاویے سے دیکھتے ہیں، اس کو سمجھنے کے لیے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ فضیلت کا یا برتری کا معیار خود خدا کی نظر میں کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اگر ہم نے یہ طے کرنا ہے کہ خدا کی نظر میں اس کی مخلوقات میں سے کون سی مخلوق بطور ایک نوع کے دوسروں سے برتر یا کم تر ہے تو اس کے لیے ہمیں معیار بھی وہی سامنے رکھنا چاہیے جو خود خدا کی نظر میں برتری کا معیار ہے۔ اس لیے کہ ہم اپنے زاویے سے اور اپنے احساسات کے لحاظ سے ایک معیار طے کریں کہ برتری کا معیار یہ ہے اور اس معیار کی روشنی میں کسی کے اوپر یا نیچے ہونے سے یہ اخذ کریں کہ وہ خدا کی نظر میں بھی کم تر یا برتر ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے منشا کی صحیح ترجمانی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں برتری کا اور فضیلت کا معیار کیا ہے، وہ اس نے خود بیان کیا ہے اور اسی کے لحاظ سے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ مردوں اور عورتوں کو بطور ایک نوع کے اس زاویے سے دیکھتا ہے یا نہیں دیکھتا۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت، جس کے اسرار کو وہی جانتا ہے، اس دنیا میں جو نظام کار مقرر کیا ہے اور مخصوص حکمتوں کے تحت جو قوانین اور قاعدے ضابطے بنائے ہیں، ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی جتنی بھی مخلوق ہے، اس سب کو اللہ نے یکساں درجے پر پیدا نہیں کیا، بلکہ تمام مخلوقات میں مختلف اعتبارات سے باہم تفاوت رکھا ہے۔ بہت سی مخلوقات ہیں جن کے بارے میں قرآن یہ بیان کرتا ہے کہ اللہ نے اپنی نعمت کے طور پر ان کو، ان کے گوشت کو اور ان کے جسم کے دوسرے اجزا کو انسانوں کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ اس نے انھیں پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ انسان ان سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ بھی اللہ کی جاندار مخلوق ہیں، لیکن خدا نے ان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ انسان ان سے فائدہ اٹھائیں۔ انسانوں کو دیکھیے۔ انسانوں میں سب مرد یکساں نہیں ہیں۔ ان میں اللہ نے صلاحیت کے لحاظ سے، ذہانت کے لحاظ سے، شکل وصورت کے لحاظ سے، جسمانی طاقت کے لحاظ سے، دنیا میں میسر مواقع کے لحاظ سے، غرض ہر لحاظ سے خود مردوں میں بھی تفاوت کے کئی پہلو رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح خواتین بھی سب یکساں نہیں ہیں۔ تو خدا کی اس دنیا میں جو اسکیم ہے، وہ مختلف مصلحتوں اور مختلف حکمتوں کے تحت یکسانی اور مساوات کے اصول پر مبنی نہیں ہے۔ دنیا کے اس محدود دائرے میں خدا کی جو اسکیم ہے، وہ تفاوت پر، درجات کے فرق پر اور مخلوقات اور خاص طور پر انسانوں کے مابین صلاحیتوں اور مواقع کے مابین فرق پر مبنی ہے اور اس نے ایک خاص مقصد کے تحت یہ ساری اسکیم بنائی ہے۔ خدا کی نظر میں فضیلت اور برتری کا جو اصل معیار ہے، وہ اس دنیا کی کامیابی یا اس دنیا کے مفادات یا اس دنیا کے privileges یا اس دنیا میں حاصل ہونے والی آسائشیں نہیں ہیں۔ خدا کی نظر میں ایک انسان کے لیے شرف کا معیار یہ ہے وہ اپنے رب کی معرفت حاصل کرے اور اچھے اعمال کے

ذریعے سے خدا کا تقرب حاصل کرے اور اس سب کے نتیجے میں جب یوم الجزاء آئے تو وہاں جنت کی صورت میں اپنے رب کی نعمتوں کی جو انتہائی اور آخری شکل ہے، اس کا مستحق قرار پائے۔

قرآن پاک یہ بات بالکل صاف لفظوں میں بیان کرتا ہے۔ اسی کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ:

إِنَّ هَـٰذَا لَهُـوَ الْـفَوْزُ الْعَظِيمُ، لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ. (الصافات: ۶۰، ۶۱)

''بے شک یہی بہت بڑی کامیابی ہے، عمل کرنے والوں کو اسی کے لیے عمل کرنا چاہیے۔''

اسی کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ:

وَفِيْ ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ. (المطففین: ۲۶)

''مسابقت کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اسی کے بارے میں مسابقت کریں۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یوں بیان فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس دنیا کی آسائشوں، نعمتوں، مال و دولت، حقوق و مفادات کی اہمیت ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کسی کافر کو، کسی منکر کو اس کا ایک ذرہ بھی عطا نہ کرتا۔ اللہ کی نظر میں تو اس دنیا کی اور اس کی آسائشوں، نعمتوں اور اس کے حقوق و مفادات کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ اس کی نظر میں شرف کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنے خالق کی صحیح معرفت حاصل کرے، اس کی بندگی کا حق ادا کرے اور عبادات کے ذریعے سے، نیک اعمال کے ذریعے سے، ایک اچھا اخلاقی رویہ اختیار کر کے خدا کا قرب حاصل کرے تاکہ جب وہ خدا کے حضور میں حاضر ہو تو اس کی بنائی ہوئی ابدی جنت کا مستحق بن جائے۔

اب یہ جو خدا کی نظر میں کامیابی کا معیار ہے، اس میں آپ دیکھ لیں کہ مرد اور عورت میں، امیر اور غریب میں، خوب صورت اور بدصورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں خدا نے ایک ہی معیار رکھا ہے جو ایمان ہے، عمل صالح ہے، اچھا اخلاق ہے، اپنے آپ کو پاکیزہ بنا کر خدا کے حضور میں حاضر ہونا ہے، بلکہ اس پہلو سے آپ دیکھیں تو وہ لوگ جو اس دنیا میں خدا کی حکمت کے تحت مختلف وجوہ سے دوسروں سے ذرا پیچھے رہ گئے اور یہاں پر انھیں کچھ suffer کرنا پڑا ہے، کچھ چیزوں میں انھیں محرومی کا سامنا کرنا پڑا ہے، ان کی اس محرومی کی وہاں اللہ تعالیٰ اس طرح سے تلافی کریں گے کہ وہ لوگ زیادہ اعزاز و اکرام کے مستحق قرار پائیں گے۔ دنیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ذہانت اور سادگی، اس لحاظ سے لوگوں میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت میں جو لوگ زیادہ جائیں گے اور جن لوگ کی کثرت ہوگی، یہ وہ لوگ ہوں گے جو دنیا میں سادہ اور ابلہ قسم کے سمجھے جاتے تھے۔ بہت ذہین نہیں سمجھے جاتے اور بہت intelligent نہیں ہیں۔ اسی طرح غریب لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ جو لوگ

دنیا میں اللہ کی حکمت کے تحت فقر میں مبتلا رہے، زیادہ مالی آسائش انھیں حاصل نہیں ہوئی، وہ اگر ایمان اور عمل صالح کے ساتھ جائیں گے تو قیامت میں ان کو مال داروں کے مقابلے میں پانچ سو سال قبل جنت میں بھیج دیا جائے گا۔

جہاں تک خواتین کا تعلق ہے تو حدیث میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور ہر دروازہ ایک خاص طبقے کے لیے مخصوص ہوگا جس نے نیکی کے اعمال میں سے کسی خاص عمل میں زیادہ نمایاں مقام پیدا کیا ہوگا۔ کسی آدمی کو نماز سے زیادہ رغبت ہے اور اس کے نامہ اعمال میں نماز کا عمل زیادہ لکھا ہوا ہے تو ایک خاص دروازہ ہوگا جہاں سے اس کو بلایا جائے گا۔ اسی طرح روزے داروں کے لیے ایک الگ دروازہ ہوگا اور انفاق کرنے والوں کے لیے الگ دروازہ ہوگا۔ آٹھ دروازے ہیں جو اللہ نے مختلف اعمال کے لحاظ سے بنائے ہیں۔ یہ بات جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تو سیدنا ابوبکر نے پوچھا کہ یارسول اللہ، کیا کوئی ایسا خوش قسمت بھی ہوگا جس کو ان آٹھوں دروازوں سے بلایا جائے گا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں، کچھ خوش قسمت ایسے بھی ہوں گے اور مجھے توقع ہے کہ تمھارا شمار بھی ان میں ہوگا۔

اب آپ دیکھیں کہ صحابہ میں سے حضرت ابوبکر کے بارے میں بھی یہ توقع ہے کہ وہ اس اعزاز کے مستحق ہوں گے، لیکن خواتین کا جنت پر جو استحقاق ہے، اس کے بارے میں دین ہمیں کیا بتاتا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی خاتون کے لیے جنت کا استحقاق ثابت ہونے کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ وہ دین کے بڑے بڑے فرائض ادا کرے، پانچ نمازیں پڑھ لے، رمضان کے روزے رکھ لے، اگر اس پر زکوٰۃ آتی ہے تو اس کو ادا کرے اور دنیا میں اللہ نے خاوند کے لیے فرماں برداری کا جو رویہ اپنانے کی ہدایت کی ہے، اس کو ملحوظ رکھے۔ گویا ہر وہ خاتون جس نے یہ بڑے بڑے فرائض پورے کر دیے اور ان کے علاوہ کوئی بہت زیادہ کوشش اس نے نہیں کی، وہ جنت کی حق دار ہے۔ ہر وہ خاتون جس نے پانچ نمازیں پڑھی ہیں، رمضان کے روزے رکھے ہیں، جس کا رویہ اپنے خاوند کے ساتھ خدا کے مقرر کردہ حدود کے دائرے میں رہا ہے تو ایسی ہر خاتون کو قیامت کے دن جنت کے آٹھوں دروازوں میں سے ہر دروازے سے آواز دی جائے گی اور اس سے کہا جائے گا کہ جس دروازے سے چاہے، جنت میں داخل ہو جائے۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں، خود خالق کی نظر میں برتری اور فضیلت کا جو معیار ہے، اس میں وہ مردوں اور عورتوں کے مابین کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔ اس پہلو سے اس نے کسی کو زیادہ اور کسی کو کم privilege نہیں دیا۔ ایسا نہیں ہے کہ مردوں کے پاس زیادہ مواقع ہیں اور عورتوں کے پاس نہیں ہیں، بلکہ خواتین

کے پاس زیادہ آسان اور نرم شرائط پر زیادہ اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے مواقع ہیں۔ فرق جو کچھ بھی ہے، وہ اس دنیا کے نظام کو چلانے کے لیے اور خاص طور پر انسانوں کی آزمائش کے لیے ایک بالکل محدود دائرے میں چند حکمتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو ایک نظام بنایا گیا ہے، وہ صرف اس میں ہے اور وہ بھی چند چیزوں میں ہے، ہر جگہ پر نہیں اور ہر معاملے میں نہیں ہے۔ دنیا میں عزت، تکریم، حسن سلوک اور دوسرے جتنے اخلاقی و سماجی حقوق ہیں، ان میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ چند جگہوں کو، گن کر تین چار کہی جا سکتی ہیں، اللہ نے خود موضوع بنا کر یہ کہا ہے کہ یہاں مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں فضیلت حاصل ہے۔

اللہ نے اس دنیا کا نظام صلاحیتوں اور مواقع کے تفاوت کے اصول پر بنایا ہے۔ معاش کے معاملے میں بھی قرآن نے یہی حکمت بیان کی ہے کہ اللہ نے سب لوگوں کو یکساں پیدا نہیں کیا۔ لوگوں کی معیشت اس لحاظ سے تقسیم کی ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے اوپر نیچے ہوں، ایک دوسرے کے محتاج ہوں اور ایک دوسرے سے کام لیتے ہوئے اور ایک دوسرے کو کام دیتے ہوئے دنیا کے نظام کو چلائیں۔ تو جیسے اس نے اپنی ساری مخلوقات کو اس اصول پر بنایا ہے کہ سب ایک دوسرے کے کام آتے ہوئے، ایک دوسرے کے مصالح اور ضروریات کو پورا کرتے ہوئے یہ نظام چلا رہی ہیں، اسی طرح اس نے اس دنیا میں جب انسانوں کو پیدا کیا ہے تو مردوں کو چند خلقی صلاحیتوں میں فوقیت دی ہے۔ مثلاً جسمانی طاقت دنیا میں زندگی کو قائم رکھنے، معاشرہ کو تشکیل دینے اور اس کے ارتقا کو آگے بڑھانے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ تحفظ انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ خود دوسرے انسانوں کے شر سے تحفظ اور اس کے علاوہ دنیا میں رہنے کے لیے انسان کی جو ضرورتیں ہیں، وہ ساری دراصل ایسی ہیں جو بنیادی طور پر محنت، مشقت اور قوت اور طاقت کے استعمال پر انحصار کرتی ہیں۔ تہذیب اس کے بعد آتی ہے جو ارتقا کے بعد بہت سی لطیف شکلیں اختیار کرتی ہے۔ فنون لطیفہ، علم و فراست اور فلسفہ و حکمت، یہ ساری بعد کی چیزیں ہیں۔ انسان کی جو بنیادی ضرورتیں ہیں جن پر زندگی کی بقا کا انحصار ہے، وہ ساری ایسی ہیں کہ ان کو انجام دینے میں اور اس معاملے میں نسل انسانی کے تسلسل کو قائم رکھنے میں مرد کا کردار بہر حال ایک بنیادی کردار ہے۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ یہ جو ایک فرق اس نے رکھا ہے اور سوسائٹی کو بنانے اور اس کی بقا کے لیے کردار ادا کرنے میں مرد کو ایک لحاظ سے جو فوقیت دی ہے، جب مردوں اور عورتوں کے سماجی حقوق و فرائض کی تقسیم کا معاملہ آئے تو کچھ چیزوں میں اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بیان کی ہے کہ جب ایک مرد اور عورت کے مابین رشتہ نکاح قائم ہو تو وہ فرق جو اللہ

نے ان دونوں کے مابین رکھا ہوا ہے، اس کو یہاں ملحوظ رہنا چاہیے۔ اس کی دونوں وجہیں اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ کچھ پہلوؤں سے اللہ نے بہر حال مرد کو ایک برتری بخشی ہے۔ خاندان کے تحفظ میں، خاندان کی ضروریات کو پورا کرنے میں اور اس کو قائم رکھنے میں اس کا کردار زیادہ بنیادی ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی برتری کی بنیاد پر اللہ نے ذمہ داری بھی مرد پر زیادہ ڈالی ہے کہ کفالت اور معاش کی ذمہ داری بھی اسی کے کندھے پر ہے۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ اس رشتے میں جب وہ بندھیں تو مرد کو ایک درجہ بالاتر حیثیت حاصل ہو اور خاتون اس کی اطاعت کو قبول کرتے ہوئے، خاندان کے اور گھر کے رازوں کی حفاظت کرتے ہوئے ایک مطیع اور فرماں بردار ساتھی کے طور پر زندگی گزارے اور اس میں اگر کسی موقع پر محسوس ہو کہ خاتون فرماں برداری کے معروف حدود سے سرکشی اختیار کر رہی ہے تو خاوند اپنے استحقاق کو جتاتے ہوئے دو تین شکلوں میں اس کی تادیب بھی کر سکتا ہے۔

اسی طرح سوسائٹی میں مرد کو کردار ادا کرنے کے مواقع زیادہ حاصل ہیں اور انسانوں کو اپنے مرد رشتہ داروں سے جو منفعت اس دنیا میں حاصل ہوتی ہے، یعنی مادی منفعت، وہ خواتین کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ یہ بحیثیت انسان ان کے درجے میں فرق کی بات نہیں ہے بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے سماج میں افراد کو ایک دوسرے سے جو مادی منفعت حاصل ہوتی ہے، مثلاً زندگی کا تحفظ ہے اور زندگی کے مسائل کا سامنا کرنے کا معاملہ ہے، اس میں مرد کی فوقیت کا حقیقت پسندانہ اعتراف ہے۔ اس لحاظ سے شریعت کی ہدایات میں جب ایک آدمی کا ترکہ تقسیم کیا جائے تو اس میں بھی یہ فرق بعض صورتوں میں ملحوظ رکھا گیا ہے کہ مرنے والے کے جو مرد رشتہ دار ہیں، ان کو اس کے مال میں بہ نسبت خواتین کے زیادہ حصہ ملے۔

اس بحث کا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ جب دین کے بعض احکام سے ہمیں صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض چیزوں میں مردوں اور خواتین میں فرق کو ملحوظ رکھنا چاہتا ہے تو اب اس بنیادی بات کی روشنی میں، جو عقلی اور نقلی دونوں اعتبار سے بہت مضبوط اور محکم ہے اور نصوص پر مبنی ہے، ایک فقہ بھی تیار ہوئی ہے۔ یہ جو دو تین چیزیں بیان ہوئی ہیں، ان کو تو قرآن نے اپنے نصوص میں بیان کر دیا ہے کہ طلاق کے معاملے میں، تادیب کے معاملے میں مرد کو ایک درجہ زیادہ حاصل ہے اور وراثت کے حصوں میں فرق ملحوظ رہے گا۔ اس کے بعد صحابہ کے دور میں اور بعد کے دور میں مسلمانوں کی ایک سوسائٹی وجود میں آئی تو ظاہر ہے کہ سوسائٹی میں مسائل یہی دو تین نہیں ہیں، اس میں تو مسائل کا ایک انبار ہے۔ ہوا یہ ہے کہ یہ جو تصور ہے کہ سماجی حقوق میں عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں نسبتاً کم مقام دیا جائے، اس نے زیادہ prevail کیا ہے اور یہ رویہ پوری فقہ میں سرایت کرتا چلا گیا ہے۔ چنانچہ آپ فقہ کا مطالعہ

کریں تو فقہا نے، خود صحابہ نے جو اجتہادی فیصلے کیے اور ان کی بنیاد پر ایک سوسائٹی تشکیل دی، اس میں آپ کو یہ بہت زیادہ اور کم و بیش ہر جگہ پر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ہمارا فقہی لٹریچر ہر جگہ اس فرق کو ملحوظ رکھتا ہے اور خواتین کو ان کے سماجی حقوق میں، ان کے خاندانی حقوق میں، ان کے معاشرتی حقوق میں اور ان کے سیاسی حقوق میں مردوں کی بہ نسبت ایک کم تر جگہ دیتا ہے۔

میرا نقطۂ نظر اس معاملے میں یہ ہے کہ یہ بات تو واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مساوات کے اصول پر شریعت نہیں دی۔ اس نے اپنی حکمتوں اور مصلحتوں کے تحت تفاوت پر مبنی احکام دیے ہیں۔ یہ تو واضح ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تفاوت کو اور اس فرق کو کیا زندگی کے جتنے بھی دائرے ہیں اور جتنے بھی مسائل اور احکام ہیں، ان سب پر اس کو لاگو کرنا چاہیے یا یہ کہ اس کو ان چند چیزوں تک محدود رکھنا چاہیے جن کے بارے میں خود قرآن نے موضوع بنا کر صراحت کر دی ہے؟ میرا ذاتی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس معاملے میں دوسرا رویہ زیادہ درست اور مبنی بر حکمت ہے اور ہم اس معاملے میں پورا حق رکھتے ہیں کہ دو تین چار چیزیں جن کے بارے میں قرآن نے خود صراحت کر دی ہے کہ یہاں پر فرق ہونا چاہیے، ان سے ہٹ کر زندگی کے جو باقی معاملات اور مسائل ہیں، چاہے وہ خاندانی نوعیت کے ہیں، چاہے وہ معاشرت سے متعلق ہیں، چاہے وہ سیاست کے دائرے میں آتے ہیں، چاہے وہ سماج میں کوئی کردار ادا کرنے سے متعلق ہیں، ان میں مساوات اور برابری کے اصول کو ترجیح دیں۔ جب خدا نے ان معاملات میں ہمیں کسی متعین ہدایت کا پابند نہیں کیا اور پھر یہ کہ خود شریعت کے قوانین کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جس میں یہ فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ وہاں پر برابری کے ساتھ ہی معاملہ ہوتا ہے تو بجائے اس کے کہ ہم تفریق کے اصول کو ماڈل بنا کر ساری سوسائٹی کو اس کے لحاظ سے تشکیل دیں، زیادہ بہتر رویہ جو قرآن و سنت کے منشا کے زیادہ قریب دکھائی دیتا ہے، یہ ہے کہ ہم تفریق کے اصول کو محدود رکھیں۔ وہ limited ہو صرف ان چند چیزوں تک جن میں ہم خدا کے حکم کے پابند ہیں، کیونکہ خدا کے حکم سے اور خدا کی قائم کردہ حد سے انحراف کرنے کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے۔ اس کو ان چند چیزوں تک محدود رکھنا چاہیے اور باقی تمام معاملات جن میں خود خدا نے یا اس کے پیغمبر نے اس طرح کی کوئی تفریق ہم پر لازم نہیں کی، وہاں ہم مساوات ہی کے اصول کو ترجیح دیں، چاہے اس سے پہلے صحابہ نے اپنے دور میں عرب معاشرت کے تناظر میں ایک خاص رجحان اپنا لیا ہو، چاہے اس کے بعد ائمہ مجتہدین نے کچھ آرا قائم کر لی ہوں اور چاہے اس کے بعد پوری امت ایک خاص ڈگر پر چلی آ رہی ہو۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ جب ہم آج اپنے لیے اپنے دور کے تہذیبی و معاشرتی تناظر میں فقہ کی تشکیل

جدید کی بات کرتے ہیں تو اس سے مقصود ماضی کی علمی وفقہی روایت کو کلیتاً غلط قرار دینا یا اس کی علمی قدر و قیمت کی نفی کرنا نہیں ہوتا۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شریعت کے معاملے میں چند واضح اور متعین ہدایات کے علاوہ ہمیں اور کسی چیز کا پابند نہیں کیا اور ایسا اس نے اس صراحت کے ساتھ کیا ہے کہ خدا نے ہمیں جتنی شریعت دینی تھی، قرآن کی صورت میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی صورت میں، وہ دے دی ہے۔ اس سے زیادہ پابندیاں وہ عائد نہیں کرنا چاہتا، اس لیے تم زیادہ سوال کر کے خواہ مخواہ اپنے لیے مشکلات پیدا نہ کرو۔ جو پابندیاں خدا تم پر عائد نہیں کرنا چاہتا، سوالات کر کے ان کو اپنے لیے لازم نہ ٹھہراؤ۔ تو جب خود قرآن کا منشا یہ ہے کہ جن پابندیوں کے بارے میں اللہ کو یہ مقصود تھا کہ وہ ملحوظ رہیں، وہ اس نے بیان کر دی ہیں اور اس کے بعد وہ ہمیں آزاد چھوڑنا چاہتا ہے تو میرے خیال میں ہمیں یہ حق ہے کہ آج کے دور میں ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے سماج میں کیا ارتقا آیا ہے، لوگوں کی اجتماعی نفسیات میں کیا تبدیلی آئی ہے اور مختلف عوامل نے معاشرے میں خواتین کے لیے مفید کردار ادا کرنے کے اور اس سے پہلے جو ان کی محرومیاں تھیں، انھیں دور کرنے کے کیا مواقع پیدا کیے ہیں۔ ہم آج کے دور میں ان چند چیزوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو قرآن نے بیان کی ہیں، از سر نو اپنی معاشرت کا جائزہ لیں، اپنی فقہ کا جائزہ لیں، اپنے قوانین کا جائزہ لیں اور برابری اور مساوات کے اصول پر اپنے طرز زندگی کو اس طرح سے استوار کریں کہ خدا کی مقرر کی ہوئی چند حدود ہرگز پامال اور متاثر نہ ہوں، جبکہ باقی تمام معاملات میں دین کی حکمتوں، اس کے آداب اور اس کی قیود کو ملحوظ رکھتے ہوئے خواتین بھی ان حقوق سے اور ان سارے مواقع سے پوری طرح مستفید ہوں جو مردوں کو حاصل ہیں۔

بہت سی چیزیں ہیں جن میں ہمارے فقہا نے اور ہمارے اہل علم نے اجتہادی طور پر ترجیحات قائم کی ہیں اور وہ منصوص نہیں ہیں۔ جب ہم 'منصوص' کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ بات قرآن میں یا حدیث میں واضح طور پر بیان ہوئی ہے اور وہاں اللہ اور اس کے رسول کا یہ منشا بھی بالکل واضح ہے کہ وہ اس فرق کو اس امتیاز کو ملحوظ دیکھنا چاہتے اور اس کی پابندی کروانا چاہتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر کوئی بھی چیز جو قرآن وسنت میں واضح طور پر بیان نہیں ہوئی یا اس کا ذکر تو آیا ہے، لیکن اس کی تعبیر ایک سے زیادہ طریقوں سے کرنے کی گنجائش موجود ہے تو اس کو علمی طور پر منصوص نہیں کہتے۔ جہاں متن میں دوسرے طریقے سے تعبیر کرنے کی گنجائش نکل آئے گی، وہ حکم منصوص نہیں رہے گا۔ اس میں آپ کو اختیار ہوگا کہ دلائل وقرائن کی روشنی میں آپ دوسرے زاویے سے اس کی تشریح کریں۔

مثلاً آپ دیکھیں کہ ہمارے ہاں یہ کم وبیش ایک متفقہ نقطۂ نظر چلا آ رہا ہے کہ اگر کسی خاتون کو قتل کر دیا گیا ہے تو اس کی دیت مرد سے آدھی ہوگی۔ یہ صحابہ کے دور سے ہے۔ ان کے ہاں بھی یہی نقطۂ نظر ملتا ہے۔ اس دور سے اب

تک کم وبیش یہ ایک مسلمہ بات ہے۔ اگر آپ عورت کا قصاص لینا چاہتے ہیں تو لے لیں، لیکن اگر دیت لینا چاہتے ہیں تو وہ مرد سے آدھی ہوگی۔ اب یہ ایک ایسی چیز ہے جو قرآن میں بیان نہیں ہوئی۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی صحیح حدیث میں بھی بیان نہیں ہوئی۔ البتہ یہ صحابہ کے ہاں موجود ہے۔ صحابہ نے اسی پر فیصلے کیے ہیں۔ حضرت عمر کے فیصلے ہیں، سیدنا علی کے فیصلے ہیں، اس لیے کہ عرب سوسائٹی میں عورت کی دیت مرد سے آدھی ہی چلی آ رہی تھی۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بے شک اس پر صحابہ کا اتفاق ہے، بے شک امت کی فقہی دانش نے collectively اسی کو قبول کیا ہے، لیکن اگر یہ خدا اور اس کے رسول کا حکم نہیں ہے، خدا اور رسول نے اس کی پابندی لازم نہیں ٹھہرائی تو پھر عرب سوسائٹی کے رجحانات کے تحت صحابہ نے اگر ایک فیصلہ کیا ہے تو اس کی پابندی ہم پر لازم نہیں۔ ہم آج دیکھیں گے کہ اگر کوئی justification ہے فرق کرنے کی تو ضرور کریں گے اور اگر نہیں ہے تو ہم اپنی تمدنی اور قانونی ضروریات کے لحاظ سے اس میں تبدیلی کر لیں گے۔

اسی طرح گواہی کا مسئلہ ہے۔ یہ بات بھی اب تک ہماری امت میں کم وبیش متفقہ سمجھی جاتی ہے کہ عورت کی گواہی اور مرد کی گواہی میں اس لحاظ سے فرق ہے کہ بعض چیزوں میں عورت کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی اور بعض چیزوں میں قبول ہوگی۔ پھر جہاں قبول ہوگی، وہاں پر بھی تناسب ایک اور دو کا ہوگا۔ زیادہ تر چیزوں میں ایسا ہی ہے۔ چند مخصوص صورتیں ہیں جن میں اکیلی عورت کی گواہی مانی جائے گی اور وہ بھی اس مجبوری کی وجہ سے کہ وہاں عورت ہی بتا سکتی ہے۔ مثلاً خواتین کے پوشیدہ معاملات ہیں یا بچے کے بارے میں بتانا ہے کہ یہ بچہ اسی عورت کا ہے، یہ ایسی چیزیں ہیں جو خواتین ہی بتا سکتی ہیں۔ تو جہاں مجبوری ہے، وہاں ایک خاتون کی گواہی کو آپ مان لیں، باقی ہر معاملے میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر سمجھی جائے گی۔

اب یہ بات کہ ایک قاضی عدالت میں فیصلہ کرتے ہوئے اس کا پابند ہے کہ اگر ایک عورت گواہی دے رہی ہو تو وہ محض اس کے عورت ہونے کی وجہ سے اس کی گواہی قبول نہ کرے، یہ قرآن میں کہیں بیان نہیں ہوئی۔ حدیث میں بھی بیان نہیں ہوئی اور میرے علم کی حد تک صحابہ نے بھی اس اصول پر کوئی تفریق نہیں کی۔ ہمارے سامنے جو بھی ذخیرہ موجود ہے، اس میں یہ بحث تابعین کے دور میں شروع ہوتی ہے۔ تابعین کے ہاں آ کر ہمیں یہ تفریق ملتی ہے کہ انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ حدود، قصاص وغیرہ میں خواتین کی گواہی قبول نہیں ہوگی۔ بعد کے کئی فقہا ایسے ہیں جو نکاح وطلاق وغیرہ میں بھی خواتین کی گواہی کو نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ صرف مالی نوعیت کے معاملات میں، لین دین کے مسئلے میں خواتین کی گواہی مانی جائے گی، لیکن ایک خاتون نکاح کی گواہ نہیں بن سکتی۔ ایک خاتون کے کہنے پر ہم

طلاق کا وقوع نہیں مانیں گے۔ یہ مختلف اجتہادی آرا ہیں۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی اگر اللہ اور اس کے رسول نے کوئی پابندی عائد نہیں کی تو پھر ہم اس کے پابند نہیں ہیں کہ پہلے لوگوں نے اگر اپنے سماجی تاثرات یا احساسات کے تحت ایک فقہ بنائی ہے تو آج ہم اس کو ضرور follow کریں۔ اسی نوعیت کی بہت سی دوسری چیزیں ہیں۔ یہ میں نے صرف مثال کے طور پر ایک دو چیزیں بیان کی ہیں۔

میری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کی پابندی اللہ نے یا اس کے رسول نے اس حیثیت سے بالکل واضح طریقے پر ہم پر لازم کی ہے کہ یہاں مرد اور عورت کے مابین فرق اور امتیاز کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور خدا کا منشا ہے، وہاں ہم سرتابی نہیں کر سکتے، لیکن اس کے علاوہ جتنے بھی معاملات ہیں، وہ چاہے کسی بھی نوعیت کے ہوں، وہاں ہم مساوات کے اصول کو زیادہ اہمیت دیں گے، الا یہ کہ کسی موقع پر دین ہی کی کوئی حکمت اور دین ہی کی کوئی مصلحت اس کا تقاضا کرے کہ فرق کو ملحوظ رکھا جائے۔

اس بحث کا آخری نکتہ یہ ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن نے وہاں فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری قرار دیا ہے، مثلاً نکاح کے رشتے کے معاملے میں یا وراثت کے حصوں کے معاملے میں یہ بات بیان ہوئی ہے، وہاں پر بھی اگر اس قانون کے نتیجے میں کسی خاص صورت میں، کسی خاص معاملے میں کوئی حقیقی مشکل پیدا ہو جاتی ہے، کوئی ایسا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے جو عدل وانصاف کے اور fairness کے عمومی تصورات سے ٹکرا رہا ہے تو یہ بھی خود دین سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا یا اس کے رسول کا بیان کردہ کوئی قانون جو عمومی طور پر اور اصولی طور پر حکمت پر مبنی ہے اور درست ہے، اگر کسی خاص وجہ سے، کسی خاص صورت حال میں، کسی اضافی وجہ سے وہ بے انصافی کا یا کوئی زیادتی پیدا کرنے کا موجب بن رہا ہو تو اس کی پوری گنجائش ہے کہ آپ اجتہاد کریں اور اس خاص دائرے میں، اس خاص معاملے میں ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے بے انصافی دور ہو جائے۔

مثلاً یہ دیکھیں کہ قرآن نے کہا ہے کہ طلاق مرد دے گا۔ رشتۂ نکاح تو عورت کی مرضی سے ہی قائم ہوگا، لیکن عورت کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ از خود رشتۂ نکاح کو ختم بھی کر دے۔ ایسا نہیں کہ وہ نکاح کو ختم کرنے میں بھی equal footing پر کھڑی ہے۔ قرآن سے ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ مرد کو یہ حق ہے کہ وہ رشتۂ نکاح ختم کر سکتا ہے، عورت از خود یہ رشتہ ختم نہیں کر سکتی۔ اب یہ جو اختیار اللہ نے مرد کو دیا ہے، وہ ان شرائط کے ساتھ ہے کہ جب کسی وجہ سے مرد اور عورت کے مابین اخلاقی حدود کے دائرے میں نباہ ممکن نہ ہو اور عورت اس کے ساتھ نہ رہنا چاہتی ہو تو مرد کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ لین دین کے مالی معاملات کو نمٹا کر اس کو فارغ کر دے۔ عورت کو تنگ کرنا یا عورت کا

شوہر کا دست نگر اور مجبور بنا کر رکھنا اس حکم کا منشا نہیں ہے۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ خاوند کو ایسا اختیار حاصل ہو جائے جس کے نتیجے میں بیوی کو بالکل اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ بھی خود قرآن سے بالکل واضح ہے۔ چنانچہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ شوہر اپنے اس اختیار کو غلط استعمال کرنے لگیں، ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ عورتوں کے لیے جائز حدود میں مطالبہ کر کے بھی طلاق لینا مشکل ہو جائے تو دین کے اصولوں کی رو سے اس کی پوری گنجائش ہے کہ آپ اجتہاد کریں اور عورت کے لیے نکاح کو ختم کرنے کا حق دینے کی کوئی مناسب صورت نکالیں۔

مثال کے طور پر ہمارے فقہا نے بہت پہلے اس کی ایک صورت یہ نکالی تھی کہ خاوند اپنا حق طلاق عورت کو تفویض کر دے۔ گویا اگر عورت یہ کہتی ہے کہ تمھیں جو طلاق کا حق ہے، وہ تم مجھے دے دو یا خاوند از خود اسے یہ حق دے دیتا ہے تو اس کی قانونی طور پر گنجائش موجود ہے۔ اس اصول پر آپ آج اجتہاد کر سکتے ہیں، لیکن کچھ شرائط کے ساتھ۔ اس کی صورت عملاً یہ بھی نہیں بن جانی چاہیے کہ قرآن جو فرق ملحوظ رکھنا چاہتا ہے، وہ سرے سے ہی ختم ہو جائے۔ کچھ شرائط کے ساتھ، اور اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ خاوند کا جو حق ہے طلاق دینے کا اور اس کی مرضی کے بغیر عورت کے جدا نہ ہونے کا، اس کا غلط استعمال نہ ہو، بیوی کے لیے حق تفریق کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے آپ نکاح نامے میں کوئی شرط لگانا چاہیں، اس کے لیے آپ عدالت کو اختیار دینا چاہیں، اس کے لیے آپ کوئی اور طریقہ اختیار کریں، مقصود یہ ہے کہ قرآن نے مرد کو جو بظاہر یک طرفہ اختیار دیا ہے، اس کے غلط استعمال سے جو بے انصافی پیدا ہوتی ہے، وہ نہ ہونے پائے۔ اس کے لیے جو بھی مناسب طریقہ آپ اختیار کریں، اس کی دین و شریعت کی رو سے پوری گنجائش موجود ہے۔

اسی طرح سے وراثت کے حصوں کا معاملہ ہے۔ اللہ نے اولاد میں جو تفریق بیان کی ہے، وہ خود قرآن کے بیان کی رو سے منفعت کے اصول پر مبنی ہے۔ عملاً کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اولاد میں سے لڑکے ماں باپ کے لیے اس طرح خدمت کا اور منفعت کا ذریعہ نہیں بنتے جبکہ بعض صورتوں میں لڑکیاں زیادہ بن جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ماں باپ نے زندگی کا وہ حصہ جس میں انھیں خدمت چاہیے تھی، بیٹی پر انحصار کرتے ہوئے گزارا اور بیٹوں نے ان کی خدمت نہیں کی تو اس صورت حال میں خود حکم کی علت کی رو سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بیٹوں کی ذمہ داری کی بنیاد پر ان کے لیے جو زیادہ حصہ مقرر کیا گیا تھا، اس کو یہاں کیسے ملحوظ رکھا جائے؟ ایسی صورت میں میرے نزدیک ان فقہی آرا سے راہ نمائی لینی چاہیے جو ورثا کے حق میں بھی وصیت کے جواز کی قائل ہیں۔ مرنے کے بعد سارے بچوں میں خدا کے بتائے ہوئے تناسب کے مطابق ترکہ تقسیم کیا جائے، لیکن اگر ماں باپ محسوس کرتے ہیں

کہ میری خدمت فلاں بیٹے یا بیٹی نے زیادہ کی ہے تو وہ وصیت کے اختیار کو استعمال کریں اور خدا کے مقرر کیے ہوئے حصوں سے الگ اس کی خدمت کی بنیاد پر یا اس کی کسی ضرورت کی بنیاد پر انصاف کی حدود کے اندر، جتنا مناسب سمجھیں، اس کے لیے کچھ وصیت کر دیں تاکہ اس نے جو خدمت کی ہے جو دوسرے لوگوں نے نہیں کی، اس کا کچھ نہ کچھ صلہ اس کو مل جائے۔

اسی طرح اگر اولاد میں سے کسی نے بالکل نافرمانی کا رویہ اختیار کر لیا ہے اور خدمت کے معاملے میں اپنے امکان کی حد تک بھی کوئی حصہ نہیں ڈالا تو ماں باپ کو یا کسی دوسرے مورث کو اس کا حق ہونا چاہیے کہ وہ ان کو exclude کر دیں جس کو ہم عاق کرنا کہتے ہیں۔ تاہم اس کی معقول وجوہ ہونی چاہییں اور اس پر عدالت کو نظر ثانی (judicial review) کا بھی اختیار ہونا چاہیے۔ عدالت یہ دیکھے کہ کیا واقعتاً اس بچے نے خدمت نہیں کی اور کیا وہ قطع تعلقی کرتے ہوئے اس درجے میں ماں باپ کی حق تلفی کا مرتکب ہوا ہے کہ اسے وراثت سے محروم کر دیا جائے؟ ان شرائط کے ساتھ میرے نزدیک ایسے ناہنجار وارثوں کو عاق کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ اس مسئلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے راہ نمائی ملتی ہے کہ قاتل کو مقتول کی وراثت میں حصہ نہیں ملے گا۔ یہ قطع تعلق کی انتہائی صورت ہے۔ جب ایک شخص نے اپنے باپ کو یا باپ نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا تو اب ان کے مابین رشتہ داری کی جو منفعت تھی، وہ بالکل ختم ہو گئی، چنانچہ اس پر مبنی حقوق بھی ختم ہو جانے چاہییں۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے نافرمان اور ناہنجار اولاد کا معاملہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ خدا نے بعض جگہ پر حقوق یا اختیارات میں جو فرق قائم کیا ہے، وہ بھی ان شرطوں کے ساتھ مشروط ہے کہ اس کے نتیجے میں عملی طور پر کوئی بے انصافی، کوئی زیادتی وجود میں نہ آئے۔ اگر کہیں وجود میں آتی ہے یا اس کا امکان ہے تو اجتہاد کرتے ہوئے اس صورت حال کو درست کرنا اور شریعت کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی متبادل طریقہ تجویز کرنا اللہ تعالیٰ کے منشا کے عین مطابق ہوگا۔

الطاف احمد اعظمی

تصور عبادت

[یہ مصنف کی طبع شدہ کتاب ''اسلامی عبادات: تحقیقی مطالعہ'' کا ایک جز ہے۔ قارئین ''اشراق'' کے افادے کے لیے اس کتاب کے جملہ مباحث بالاقساط شائع کیے جا رہے ہیں۔]

مسلمانوں نے ایک طویل عرصہ سے دوسرے اقوام کی طرح عبادت کو پرستش کا ہم معنی سمجھ لیا ہے جو ایک بڑی غلطی ہے اور اس کے نتائج مہلک ہیں، اس لیے ہم نے ضروری خیال کیا کہ عبادات ثلاثہ پر گفتگو سے پہلے چند بڑے مذاہب کے تصور عبادت کے ساتھ اسلام کے وسیع اور جامع تصور عبادت کا ذکر کیا جائے، تاکہ اسلامی عبادات کے امتیازات واضح ہوں اور مسلمانوں کو بھی معلوم ہو کہ ان کی موجودہ عبادتیں اسلام کے تصور عبادت سے کس حد تک موافقت رکھتی ہیں اور عجمی تصور عبادت کے اثرات کہاں کہاں اور کن صورتوں میں موجود ہیں۔

ہندو مذہب میں عبادت

ہندو مذہب میں عبادت کا مروجہ تصور بہت محدود اور بڑی حد تک مشرکانہ ہے یعنی مورتی پوجا اور بعض مذہبی رسوم کی ادائیگی۔ ایسا نہیں کہ ان کی مذہبی کتابوں میں توحید کا تصور ہی موجود نہیں ہے۔ بعض کتابوں میں آج بھی توحید کی تعلیم ملتی ہے اور ان میں واضح لفظوں میں مورتی پوجا کی ممانعت کی گئی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''اس ہستی کی کوئی مورتی یا تصویر نہیں، اس کا نام ہی سراپا تعریف ہے۔'' (یجر وید ۳:۳۲)

''وہ ایک ہی ہے، اسی کی عبادت کرو۔'' (رگ وید ۱۶:۶:۴۵)

''ایشور ہی اول ہے اور تمام مخلوقات کا اکیلا مالک ہے، وہ زمین اور آسمانوں کا مالک ہے۔ اسے چھوڑ کر تم کون

سے خدا کو پوج رہے ہو۔'' (رگ وید ا: ۱۰،۱۲)

توحید کی یہ تعلیم ان کی فلسفیانہ مذہبی کتاب اپینشد میں ان لفظوں میں موجود ہے: ایکم برہم دوستیہ ناستے۔نیہ۔نا۔ ناستے کنچن ''ایک ہی خدا ہے، دوسرا نہیں ہے، نہیں ہے، ذرا سا بھی نہیں ہے۔'' اس معاملے میں ہندو فلاسفہ اس حد کو پہنچ گئے کہ انھوں نے صفات سے انکار کر دیا (نیٹی نیٹی) کہ اس سے خدا کی وحدت متاثر ہوتی ہے۔

ان تنزیہی تصور خدا کے باوجود ان کا یہ خیال ہے کہ خدائے واحد اس کائنات مادی سے ماورا نہیں بلکہ اس میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس تصور کے مطابق کائنات کی تمام چھوٹی بڑی چیزیں اس کے مظاہر کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے ان کی پرستش دراصل خدا ہی کی بالواسطہ عبادت ہے۔ پوچھا گیا کہ فی الحقیقت کتنے خدا ہیں؟ یجنا والکیہ نے کہا ''ایک'' اچھا تو بتاؤ کہ اگنی، وایو، آدیتیا، کال (وقت) پران (سانس) انّ (غذا)، برہما، رودرا اور وشنو میں سے ہر ایک کی کچھ لوگ اُپاسنا کرتے ہیں، ان میں سب سے اچھا معبود کون ہے؟ اس نے جواب دیا ''یہ سب جن کا ذکر ہوا دراصل اعلیٰ، غیر فانی اور غیر مادی حقیقت (برہمن) کے مظہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے حقیقت اعلیٰ ہی کا دھیان رکھنا چاہیے البتہ اس کے جو مظاہر ہیں ان کی بھی آدمی عبادت کر سکتا ہے اور ان کو چھوڑ بھی سکتا ہے[1]۔

اس خیال یعنی ہمہ اوست[2] کے نظریے نے ان کو پہلے مظاہر پرستی اور پھر اصنام پرستی کی منزل تک پہنچایا اور آج ہندو قوم کی اکثریت شرک کی مختلف انواع میں گرفتار ہے۔ مرئی اور غیر مرئی ہر قوت ان کی نظر میں معبود کا درجہ رکھتی ہے اور اس طرح ان کے معبودوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ ہندوؤں (آریہ سماجیوں[3] کی ایک مختصر جماعت کو چھوڑ کر) کے نظام عبادت میں مورتیوں[4] کے سامنے سر جھکانا، نذر و نیاز چڑھانا، تالی پیٹنا اور مندر کی گھنٹی بجانا وغیرہ جیسے رسوم داخل ہیں۔ ہندوؤں کی عبادت کے بعض طریقے عہد نبوی کے مشرکین کے عبادتی طریقوں سے بہت کچھ

۱؎ انڈین فلاسفی، ڈاکٹر رادھا کرشنن، ج ا ص ۱۴۴۔

۲؎ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی خیال کی بدلی ہوئی شکل وحدت الوجود کا نظریہ ہے جو ماضی میں طبقۂ صوفیاء میں کافی مقبول رہ چکا ہے اور آج بھی اس کے کچھ اثرات بعض مذہبی حلقوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں راقم کی کتاب ''وحدت الوجود، ایک غیر اسلامی نظریہ''۔

۳؎ آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی (۱۸۲۴-۱۸۸۳) تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۵ء میں اس اصلاحی تحریک کا آغاز کیا تا کہ ہندو سماج کی اصلاح ہو۔ وہ مورتی پوجا کے سخت خلاف تھے اور صرف ویدوں کو الہامی کتاب مانتے تھے۔

۴؎ مورتیاں دراصل دیوتاؤں کی شبیہیں ہوتی ہیں۔ دیوتا کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں اور اس سے مراد نوری مخلوق یعنی فرشتے ہیں۔

ملتے جلتے ہیں۔قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَمَا كَانَ صَلاَتُهُمْ عِندَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاء وَتَصْدِيَةً. (سورۂ انفال ۳۵)

''اور بیت اللہ کے سامنے ان کی نماز سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

شرک سے ہندو ذہن کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سے تیرتھ استھانوں کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے اور ان کی زیارت کو ذریعۂ نجات خیال کیا جاتا ہے۔ایک ہندو مؤرخ لکھتا ہے:

''اجودھیا سے زیادہ کوئی مقام متبرک نہیں ہے۔اس شہر کے باشندے تمام گناہوں سے پاک ہیں۔جو شخص یہاں آکر درشن کرتا ہے یا یہاں آنے کا ارادہ اپنے دل میں کر لیتا ہے تو اس کو اور اس کے بزرگوں کو نجات کی دولت مل جاتی ہے۔اور جو کوئی اس سفر کے لیے کسی کو زر نقدی یا سواری دیتا ہے تو اس کو جگ اسمید کا ثواب ملتا ہے اور وہ اور اس کی اولاد بیوان پر چڑھ کر بہشت کو جاتی ہے۔''

(تاریخ اجودھیا، مصنفہ کنور درگا پرشاد (تعلقہ دار ریاست سروین، بڑا گاؤں) ص۹)

اسی مؤرخ نے مزید لکھا ہے کہ:

''سرگدوار دریائے سرجو پر ۳۱۸ گز تک محدود ہے۔یہ مقام دنیا بھر سے متبرک ہے۔جو شخص یہاں مرتا ہے ہزار جنم کے گناہ اس کے معاف ہو جاتے ہیں اور اس کو آواگون سے نجات مل جاتی ہے۔''

(تاریخ اجودھیا، مصنفہ کنور درگا پرشاد (تعلقہ دار ریاست سروین، بڑا گاؤں) ص۱۵)

اہل ہنود یہی عقیدہ دریائے گنگا کے بارے میں رکھتے ہیں کہ اس میں نہانے سے سارے گناہ دھل جاتے ہیں[۵]۔

ہندوؤں کے تصور عبادت کی دوسری نمایاں خصوصیت ترک دنیا اور نفس کشی ہے۔ان کا سب سے بڑا عابد وہ شخص ہے جو دنیا چھوڑ کر پہاڑوں اور جنگلوں میں جا بسے اور وہاں اپنی تمام خواہشات کو فنا کر کے ایشور کی تپسیا کرے[۶]۔ایسے لوگ جوگی کہلاتے ہیں یعنی خدا رسیدہ۔ڈاکٹر برنیر[۷] لکھتا ہے:

۵۔ الٰہ آباد (یوپی) میں دریائے گنگا کے کنارے مہا کمبھ کا جو میلہ ہوتا ہے اس میں ہندو اسی خیال کے تحت کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔

۶۔ تپسیا، مراقبہ کی صورت میں ہوتی ہے، اور اس میں مظاہر کی پرستش بھی شامل ہے۔

۷۔ Francois Bernier ایک فرانسیسی سیاح تھا جو سترہویں صدی میں ہندوستان آیا۔اس کا سفرنامہ Travels in the Mughal Empire, Archibald Constable London, 1891 A.D کے نام سے چھپ چکا ہے اور ''وقائع سیر و سیاحت'' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

''یہ لوگ ایسے عجیب طور پر زندگی بسر کرتے ہیں کہ اگر میں اس کو بیان کروں تو مجھے شک ہے کہ آیا اس پر کوئی اعتبار کرے گا۔ خصوصاً میرا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو جوگی کہلاتے ہیں اور جس کے معنی ہیں خدا سے ملا ہوا۔ بہت سے جوگی بالکل ننگے رات دن تالابوں کے پاس بڑے بڑے درختوں کے نیچے یا مندروں کے اردگرد کے مکانوں میں راکھ کا بستر کیے بیٹھے یا پڑے رہتے ہیں۔ بعض کی جٹیں پنڈلیوں تک لٹکتی ہیں۔ بہت سے جوگی ایک یا دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے رکھتے ہیں۔ ناخنوں کو اس قدر بڑھاتے ہیں کہ بڑھ کر مڑ جاتے ہیں۔ ان کے بازو سخت اور غیر طبعی ریاضت کی حالت میں کافی غذا نہ پہنچنے کی وجہ سے مزمن بیماریوں میں مبتلا اشخاص کی طرح سوکھ کر نہایت دبلے پتلے ہو جاتے ہیں اور رگوں اور پٹھوں کے خشک اور سخت ہو جانے کے باعث اس قابل نہیں رہتے کہ جھکا کر ان سے کچھ منہ میں ڈال سکیں۔ ان فقیروں کے پاس ان کے چیلے حاضر رہتے ہیں جو ان کو نہایت ہی مہاتما سمجھ کر ان کا بڑا ادب کرتے ہیں۔'' (وقائع سیر و سیاحت (سفرنامۂ برنیر) ج ۲، ص ۱۹۰)

وہ مزید لکھتا ہے:

''بعض فقیروں کی نسبت مشہور ہے کہ وہ بڑے روشن ضمیر اور کامل جوگی ہیں اور حقیقت میں خدا رسیدہ ہیں۔ ان کی نسبت بالکل تارک الدنیا ہونے کا گمان ہے۔ یہ فقیر راہبوں کی طرح آبادی سے دور کسی باغ میں تنہا زندگی بسر کرتے ہیں اور شہر میں کبھی نہیں آتے۔ اگر کوئی شخص ان کو بھوجن لا کر دے دے تو لے لیتے ہیں اور اگر کوئی نہ لائے تو عوام کے خیال کے مطابق یہ مہاتما لوگ بھوجن کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ یہ مقدس لوگ اکثر مراقبہ کی حالت میں رہتے ہیں۔ ان کا ادّعا ہے، اور ایک فقیر نے خود مجھ سے کہا، کہ ہماری روحیں گھنٹوں بے خودی اور استغراق کی حالت میں رہتی ہیں، ہمارے ظاہری حواس معطل ہو جاتے ہیں اور ہم کو خدا کا دیدار حاصل ہوتا ہے جو ایک نا قابل بیان سفید اور چمکدار نور کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اور ہم کو دنیا کے بکھیڑوں سے بالکل نفرت ہو جاتی ہے اور سرور خالص کی حالت میں ہم ایسے محو ہو جاتے ہیں جو نا قابل بیان ہے۔''

(وقائع سیر و سیاحت (سفرنامۂ برنیر) ج ۲، ص ۱۹۷)

یہ ٹھیک اسی قسم کی رہبانیت ہے جو عہد تاریک میں عیسائی رہبان کی خصوصیت رہی ہے۔ ہندو عبادت کی تیسری نمایاں خصوصیت مشرکانہ اعمال و رسوم کی کثرت ہے اور آج بھی یہ صورت برقرار ہے۔ ۲۰۰۲ میں گجرات میں خشک سالی کی وجہ سے لوگ کافی پریشان تھے۔ چنانچہ بارش دیوتا کو خوش کرنے کے لیے صوبے کے مختلف مقامات پر مختلف قسم کی مشرکانہ رسوم انجام دی گئیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

"The government may not have given any directive this time round. but

various organizations all over the state are praying for a revival of the monsoon. people are resorting to all sorts of methods to solicit divine intervention to avoid a drought. In Vadodra, plans are underway to bathe an elephant, in Rajkot a round-the-clock Yagna is going on, in Ahmedabad farmer leaders have forsaken food to bring in the elusive showeres. People in Saurashtra and kutch are offering prayers, performing Yagna and chanting Ram Dhun to appease the Rain God. The Maharashi Dayanand Sarswati Smarak Trust at Tankara has launched vrusthi Yagna. About 150 students have been chanting vedic mantras continuously for a week from Monday. And from Friday on wards, the chanting has gone round-the-clock. The mahant of the jagannath temple said: "In a way, it is saying sorry for any misdeed that could have upset God." The Shiv Sena has also organized a varun Yagna at Kutyana on Sunday. Rituals will be performed at Junagadh, Morbi, Bhayavadar, Veraval and porbunder. Even the Vadodara Municipal Corporation;s water supply committee and the Satyam Shivam Sundaram Samiti conducted parjanya Yagna - a ceremony where an elephant well be bathed with pomp and fanfare while a group of Brahmins will invoke Lord Indira."

(Sunday, The Times of India, New Delhi, August 4, 2002, p.6)

ہندوؤں کے تصور عبادت میں خدا (بھگوان، برہما) کے احکام و ہدایات کی تعمیل کا کوئی تصور نہیں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں گیان (معرفت) کو کرم (عمل) پر فوقیت حاصل ہے۔ خدمت خلق کا تصور بھی غیر واضح ہے گو کہ دوسرے مذاہب کی طرح خیرات (دان پنّ) کو اس مذہب میں بھی اہمیت دی گئی ہے۔

یہودی مذہب میں عبادت

یہودی مذہب میں عبادت کا مفہوم بہت واضح ہے، یعنی خدائے واحد کی پرستش[۸] تورات میں فرمایا گیا ہے:

”تم اپنے لیے بتوں کو یا کسی ترشی ہوئی مورت کو نہ بنائیو اور نہ پوجنے کی لاٹ کو کھڑا کرو اور نہ اپنے لیے کوئی صورت دار پتھر اپنے ملک میں قائم کرو کہ اس کے آگے سجدہ کرو اس لیے کہ میں خداوند تمھارا خدا ہوں۔“

---

۸ زبور مکمل طور پر خدائے واحد کی حمد وستائش پر مشتمل ہے۔

(کتاب احبار، باب ۱/۲۶)

تورات کے اس صریح حکم کے باوجود یہود اپنی تاریخ کے ہر دور میں شرک جلی یعنی اصنام پرستی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَجَاوَزْنَا بِبَنِیۡ إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْاْ عَلَى قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَى أَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُواْ يَا مُوسَى اجْعَل لَّنَا إِلَـهاً كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ. (سورۂ اعراف ۱۳۸)

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتار دیا پس ان لوگوں کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں سے لگے بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا، اے موسیٰ، ہمارے لیے بھی ایک ایسا ہی معبود (مجسم) مقرر کر دیجیے جیسے ان کے یہ معبود ہیں۔ موسیٰ نے کہا، بلاشبہ تم سخت نادان لوگ ہو۔''

موسیٰ علیہ السلام کی حیات ہی میں یہودیوں نے گوسالہ پرستی کی جس کا ذکر قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے:

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَى مِن بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلاً جَسَداً لَّهُ خُوَارٌ أَلَمْ يَرَوْاْ أَنَّهُ لاَ يُكَلِّمُهُمْ وَلاَ يَهْدِيهِمْ سَبِيلاً اتَّخَذُوهُ وَكَانُواْ ظَالِمِينَ. (سورۂ اعراف ۱۴۸)

''اور موسیٰ کی قوم نے اس کے (کوہ طور پر چلے جانے کے) بعد اپنے زیوروں سے ایک مجسم بچھڑا بنا لیا، اور اس سے ایک قسم کی آواز نکلتی تھی۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ نہ ان سے بات کرتا تھا اور نہ ان کی رہنمائی کرتا تھا (لیکن اس کے باوجود) انھوں نے اس کو معبود بنا لیا اور وہ (یقیناً) ظالم (مشرک) تھے۔''

قوم یہود کی اس بت پرستانہ ذہنیت کا ثبوت تورات میں بھی موجود ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد کے ادوار میں بھی اصنام پرستی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ کتاب یسعیاہ میں ایک جگہ بیان ہوا ہے:

''وہ اہل مشرق کے رسوم سے پر ہیں اور فلیتوں کی مانند شگون لیتے ہیں ...ان کی سرزمین بتوں سے پر ہے۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں کی صنعت یعنی اپنی انگلیوں کی کاریگری کو سجدہ کرتے ہیں۔'' (کتاب یسعیاہ، باب ۲/۶-۸)

یہودیوں کا مذہبی طبقہ گو کہ بت پرستی سے کنارہ کش رہا لیکن عبادت میں ریا اور نمود کے مرض سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس کے علاوہ انھوں نے جو نظام عبادت وضع کیا اس میں عبادت کے خارجی اعمال و رسوم اور بزرگان سلف کی روایات کی پاس داری پر بہت زیادہ زور دیا گیا اور اسی چیز نے رفتہ رفتہ عبادت کے مقصود یعنی تزکیۂ نفس کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودیوں کے مذہبی طبقہ کا جو حال زبوں تھا وہ انجیل

کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

''اے ریا کار فقیہو اور فریسیو (یہودی علماء وفقہاء) تم پر افسوس کہ تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھتے ہو اور دکھاوے کے لیے نماز کو طول دیتے ہو۔ تمھیں زیادہ سزا ہوگی۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ پودینہ، سونف اور زیرہ پر تو دہ یکی دیتے ہو لیکن شریعت کی زیادہ اہم باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو! مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم پیالے اور رکابی کو اوپر سے خوب صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیز گاری سے بھرے ہیں۔ اے اندھے فریسی! پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کرو تاکہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردہ کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو لیکن باطن میں ریا کاری اور بے دینی سے بھرے ہو۔'' (متی باب ۲۳: ۲۰-۲۸)

یہودیوں میں ظواہر عبادت پر اصرار کا ایک بڑا سبب مذہبی احکام وشرائع کی کثرت ہے جس کی وجہ سے مقصود عبادت سے ان کی نظر ہٹ گئی۔ مثلاً ان کے ہاں جانوروں کی قربانی ایک بڑی عبادت ہے۔ کتاب احبار کے بالکل شروع میں سوختنی قربانی کے متعلق فرمایا گیا ہے:

''اگر اس کی قربانی، سوختنی قربانی، گائے بیل سے ہو تو بے عیب نر لائے۔ جماعت کے خیمے کے دروازے پر اپنے مقبول ہونے کے لیے خداوند کے آگے لائے اور وہ سوختنی قربانی کے سر پر اپنا ہاتھ رکھے کہ اس کے لیے قبول کی جائے اور اس کے لیے کفارہ ہو۔ اور وہ اس بیل کو خداوند کے حضور ذبح کرے اور کاہن، جو بنی ہارون ہیں، لہو کو لائیں اور اس کو مذبح پر ہر طرف جو جماعت کے خیمے کے دروازے پر ہے، چھڑکیں۔ تب وہ اس سوختنی قربانی کی کھال کھینچے اور اس کو عضو عضو جدا کرے۔ پھر ہارون کاہن کے بیٹے مذبح پر آگ رکھیں اور اس پر لکڑیاں ترتیب سے چنیں اور بنی ہارون جو کاہن ہیں، اس کے عضوؤں کو اور سر اور چربی کو ان لکڑیوں پر جو مذبح کی آگ پر ہیں، ترتیب سے رکھ دیں، اور وہ اس کے اوجھ اور پاؤں کو پانی سے دھوئیں اور کاہن سب کو مذبح پر جلائے کہ سوختنی قربانی یعنی خوشبو آگ سے، خداوند کے لیے۔''

(احبار، باب ۱: ۱-۹ (کتاب احبار میں زیادہ تر قربانی کے احکام مذکور ہیں۔))

یہودی سمجھتے تھے کہ قربانی کا گوشت جلانے سے جو خوشبو نکلتی ہے اس سے خدا خوش ہوتا ہے جیسا کہ کتاب احبار کی مذکورہ بالا عبارت کے آخری جملہ سے بالکل ظاہر ہے۔ یہ ایک بالکل سطحی اور طفلانہ تصور عبادت تھا۔ بعض احادیث

سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں میں ظواہر عبادت پر زور زیادہ تھا۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تم نماز پڑھو تو تہ بند باندھ لیا کرو یا چادر اوڑھ لیا کرو، یہودیوں کی طرح (ننگے) نماز نہ پڑھو۔ ''نماز میں یہودیوں کی طرح نہ جھومو[9]'' ''تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے اور جوتے پہنے رہو[10]'' ''میری امت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے[11]۔''

ظواہر عبادت پر زیادہ زور دینے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی عبادت میں اخلاص وللّٰہیت کے بجاے ریا ونمود داخل ہو گیا۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ یہودی علماء عوام کو دکھانے کے لیے لمبی لمبی نمازیں پڑھتے تھے۔ ان کے روزے بھی اس خرابی سے محفوظ نہ تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا:

> ''پھر جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ (یہود) اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھیریں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے۔ پر جب تم روزہ رکھو تو اپنے سر میں تیل لگاؤ اور منہ دھوؤ تاکہ تم آدمیوں پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، تجھ کو آشکار بدلہ دے۔'' (متی، باب ۶:۱۶-۱۸)

یہودیوں کے تصور عبادت میں ترک دنیا اور نفس کشی کا کوئی عنصر نہیں ملتا اور یہ بظاہر ایک خوبی معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل اس کی وجہ زر پرستی اور دنیا کی زندگی سے ان کا غیر معمولی لگاؤ ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ ان کا ہر آدمی ہزار سال تک زندہ رہنا چاہتا ہے (سورۂ بقرہ: ۹۶) انجیل میں ہے کہ ایک بار ایک یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ابدی زندگی کے حصول کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے اس کو بعض دینی احکام پر عمل کی ہدایت کی۔ اس نے کہا، میں تو ایک مدت سے ان حکموں پر عمل پیرا ہوں۔ آپ نے فرمایا، اچھا تو کامل بننا چاہتا ہے۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا، جاؤ اور اپنی کل دولت اور سب مال ومتاع بیچ کر میرے پیچھے آ لگو۔ یہ سن کر وہ غمگین ہوا کہ دولت مند تھا[12]۔

۹؎ کنز العمال، ج ۴، ص ۷۲۔

۱۰؎ کنز العمال، ج ۴، ص ۱۱۲۔

۱۱؎ کنز العمال، ج ۴، ص ۱۱۴۔

۱۲؎ متی باب ۶:۶، ۷۔

عیسائی مذہب میں عبادت

عیسائیوں کے تصور عبادت میں شرک پوری طرح دخیل ہے۔ اور یہ شرک نظری اور عملی دونوں طرح کا ہے۔ عیسائیوں کی اکثریت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور لارڈ (رب) قرار دیتی ہے۔ شاہ قسطنطین (۳۰۶-۳۳۷ء) کے عہد میں نیقا کے مقام پر ۳۲۵ء میں تمام چرچوں کی جنرل کونسل میں عیسائیوں کا جو متفق علیہ عقیدہ قرار پایا وہ یہ تھا:

> ''ہم خدائے واحد پر ایمان رکھتے ہیں یعنی باپ پر جو مقتدر اعلیٰ ہے، جو تمام مرئی اور غیر مرئی اشیاء کا خالق ہے، اور آقا (لارڈ) عیسیٰ مسیح پر ایمان رکھتے ہیں جو خدا کا بیٹا ہے، جو باپ سے پیدا ہوا، اور ایک ہی ہے جو باپ سے پیدا ہوا، جس کا جوہر باپ کے جوہر کی طرح ہے۔ خدا سے خدا، روشنی سے روشنی، خدا سے سچا خدا، ساختہ نہیں آفریدہ۔ خدا کے جوہر سے متحد، جس کے ذریعہ تمام اشیاء خلق ہوئیں خواہ وہ اشیاء آسمان میں ہوں یا زمین میں، جو ہماری نجات کے لیے آسمان سے نیچے آیا، جسدی ظہور ہوا، آدمی بنا، دکھ سہے اور تیسرے دن اٹھ کھڑا ہوا اور آسمان کی طرف صعود کر گیا۔'' (اے شارٹ ہسٹری آف آور ریلیجن (ڈی سی سمرویل) ص ۸۹)

اس عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیوں نے خدا کے ساتھ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی شریک عبادت کر لیا۔ یہ شرک صرف دعا اور طلب حاجات تک محدود نہ تھا بلکہ کھلی بت پرستی (Image Worship) تک پہنچ گیا۔ مسیحی روما کے کلیساؤں میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے مجسمے نصب تھے اور دیواریں ان کی تصاویر سے آراستہ تھیں اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ اس بت پرستی کے خلاف جب بھی حکومت کی طرف سے آواز بلند ہوئی تو اس کی مخالفت سب سے زیادہ پادریوں اور راہبوں نے کی۔[۱۳] ایک عیسائی مورخ ان کی بت پرستی کے متعلق لکھتا ہے:

> ''مشرق میں رومن بادشاہ (Leo the Isavian) کو یقین تھا کہ اللہ نے مذہب اسلام کو اس لیے بھیجا ہے تاکہ وہ بت پرست عیسائیوں کو سزا دے جو تماثیل اور مقدس آثار کی پرستش کرتے تھے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ تمام چرچوں میں تصاویر اور مجسموں کو توڑ دیا جائے۔'' (اے شارٹ ہسٹری آف آور ریلیجن، ص ۱۵۷)

اس شرک میں عیسائیوں نے اپنے اولیاء (عیسائی رہبان) کو بھی شریک کر لیا تھا۔ راہبوں میں سے جو راہب اپنے روحانی کمالات میں زیادہ شہرت حاصل کر لیتا اس کے متعلق عیسائی یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ صاحب کشف و کمال ہے، جو چاہے کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے پاس اپنی حاجتیں لے کر جاتے اور وہ ان سے نذریں لے کر یقین دلاتا

۱۳؎ تفصیل کے لیے دیکھیں: ہسٹری آف انٹلکچول ڈویلپمنٹ آف یورپ، جان ولیم ڈریپر، ج ۱، ص ۴۰۵ تا ۴۱۲۔

تھا کہ ان کی حاجتیں پوری ہو جائیں گی۔[14] بعد کے ادوار میں ایسے راہبوں کے مقابر پر عیسائی جوق در جوق جمع ہوتے اور ان کو صاحب اختیار سمجھ کر ان سے اپنی حاجتیں طلب کرتے۔ ان کے مقابر سجدہ گاہ بن گئے تھے۔ قرآن مجید میں عیسائیوں کی اولیاء پرستی کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے:

اتَّخَذُواْ أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُواْ إِلاَّ لِيَعْبُدُواْ إِلَـهاً وَاحِداً لاَّ إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ. (سورۂ توبہ ۹: ۳۱)

''انھوں نے اللہ کے سوا اپنے فقیہوں اور راہبوں کو رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ انھیں صرف ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھیراتے ہیں۔''

عیسائیوں کے تصور عبادت کی دوسری نمایاں خصوصیت رہبانیت یعنی ترک دنیا اور نفس کشی ہے۔ اس معاملے میں عیسائی راہب اور ہندو جوگی یکساں ہیں۔ یورپ کے عہد تاریک (1000-400) میں اس تصور نے ناقابل بیان حد تک فروغ پایا۔ عیسائی مورخ ڈی سمرویل لکھتا ہے:

''عیسائیت نے زہد و تقویٰ کے لیے ترک دنیا کو لازمی قرار دیا۔ عیسائی راہبوں کے نزدیک ازدواجی زندگی اور والدین جیسے دنیوی علائق سے زیادہ اہم چیز خود اپنی زندگی اور نفس کا تزکیہ تھا۔ چنانچہ اس تصور کے تحت وہ انسانی آبادیوں سے نکل کر جنگلوں، پہاڑوں اور دوسرے مقامات پر جانے لگے، ایک دو کی تعداد میں نہیں، ہزاروں کی تعداد میں۔ ان مقامات پر وہ نہایت فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے، گندی حالت میں رہتے اور بیماریوں کو دیدہ و دانستہ دعوت دیتے تھے سینٹ ایسوبیس (St. Eusebius) تین سال تک ایک خشک کنویں میں محو عبادت رہے۔ سینٹ سبینوس (St. Sabinus) صرف موٹے اناج پر جو مہینوں پانی میں بھیگ کر سڑ جاتے تھے، زندگی گزارتے تھے۔ سینٹ بساریان (St. Basarion) نے چار دن اور چار راتیں کانٹوں کی جھاڑی کے درمیان گزاریں۔

اس نفس کشی کی سب سے بھیانک مثال سینٹ سمیان (St. Simeon) کی ہے۔ انھوں نے اپنے جسم کو رسیوں سے اتنا کس کر باندھ لیا تھا کہ یہ رسیاں ان کے گوشت میں پیوست ہو کر سڑ گئیں۔ ان کے جسم سے اتنی سخت بدبو آتی تھی کہ کوئی شخص ان کے پاس کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ جب وہ حرکت کرتے تو ان کے جسم سے کیڑے گرتے تھے۔ انھوں نے ۶۰ فیٹ اونچا ایک مینار بنوایا تھا جس کا محیط ایک گز رتھا۔ اس مینار پر وہ تیس سال تک ہر قسم کے موسم میں محو عبادت رہے۔ یہی عیسائی ولی ایک سال تک ایک پیر پر کھڑے رہے اور دوسرے پیر کو جس میں قرحہ تھا ڈھانک

---

[14] اے شارٹ ہسٹری آف آور ریلیجن، ص ۱۵۷۔

رکھا تھا۔ جب کوئی کیڑا اس زخم سے گر جاتا تو ان کا سوانح نگار جوان کے پاس ہی رہتا تھا اس کو اٹھا کر دوبارہ زخموں میں رکھ دیتا تھا اور یہ فقیر ان کیڑوں سے کہتا: کھاؤ جو خدا نے تم کو دیا ہے۔ اس عیسائی ولی کا جب انتقال ہوا تو دین عیسوی کے ماننے والوں اور ان کے علماء مجتہدین کا ایک ہجوم ان کے جنازے میں شریک ہوا اور ہر شخص کی زبان پر یہی صدا تھی ''وہ سب سے عظیم عیسائی درویش کا نمونہ تھے''۔

(اے شارٹ ہسٹری آف آور ریلیجن، ص ۱۴۵، ۱۴۶)

چھٹی صدی عیسوی میں اس ترک دنیا بلکہ نفرت دنیا میں کمی ہوئی اور عیسائی رہبان جنگلوں اور پہاڑوں کے بجائے ایک جگہ خانقاہ بنا کر رہنے لگے لیکن دنیا سے بے التفاتی ہنوز قائم رہی، اور یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے آغاز تک کسی نہ کسی صورت میں اس کا سلسلہ جاری رہا۔

عیسائیوں کے تصور عبادت کی مذکورہ خرابیوں میں اب کافی کمی آ گئی ہے، رہبانیت کے اعمال و مظاہر تقریباً معدوم ہو چکے ہیں۔ لیکن شرک آج بھی باقی ہے۔ عیسائی قوم اپنی تمام سائنسی فتوحات اور روشن دماغی کے باوجود مذہبی معاملے بالخصوص عقیدۂ توحید کے باب میں کل کی طرح آج بھی اپنی سابقہ طفلانہ روش پر قائم ہے، یعنی یہ کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے اور اس دنیا کے لارڈ (رب) ہیں۔

دیگر مذاہب کی طرح عیسائی مذہب میں بھی غرباء مساکین کی امداد و اعانت کو ایک بڑی نیکی خیال کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں رہبانیت کے فروغ کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ ہو سکی لیکن رہبانیت کے خاتمہ کے ساتھ ہی اس تصور نے کافی ترقی کی اور آج اس پہلو سے عیسائی قوم جملہ اقوام عالم سے آگے ہے۔ آج دنیا کے جس ملک میں بھی طوفان، زلزلہ، قحط، وبائی امراض اور خانہ جنگی جیسے واقعات پیش آتے ہیں وہاں عیسائیوں کی مختلف تنظیمیں آفت رسیدوں کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ملکوں میں عیسائی مشنریوں نے شفاخانے قائم کیے ہیں جہاں پوری لگن کے ساتھ غریبوں اور محتاجوں کو طبی امداد مہیا کی جاتی ہے۔ مدر ٹریسا کی خدمات سے کون انسانیت نواز واقف نہ ہوگا۔

عیسائیوں کے اس طرز عمل کی تفہیم انجیل میں بیان کردہ ایک روایت سے ہوتی ہے۔ ایک بار یہودی علماء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس بغرض امتحان آئے اور پوچھا کہ اے استاد! تورات کی اولین اور اہم تعلیم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اپنے پورے دل اور پوری جان سے خدا سے محبت رکھ اور اسی طرح پورے دل اور پوری جان سے اپنے پڑوسی سے محبت رکھ۔[۱۵] عیسائیوں نے اپنے پیغمبر کی اس سادہ تعلیم کو حرز جان بنا لیا بالخصوص اس کے دوسرے جز یعنی

۱۵؎ متی، باب ۲۲: ۳۶ تا ۴۰)

خدمت خلق کو۔ آج یہی ایک چیز ان کے مذہب کا طغرائے (طرۂ) امتیاز ہے۔

دنیا کے تین اہم مذاہب کے تصور عبادت کی توضیح کے بعد اب ہم اسلام کے تصور عبادت کی شرح و تفصیل کریں گے۔

اسلام میں عبادت

اسلام کے تصور عبادت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے لفظ عبادت کے معنی و مفہوم کو، جو عربی زبان ہی کا ایک لفظ ہے، ذہن نشین کر لیں۔ عبادت کے لغوی معنی انتہائی عجز و تذلل کے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں:

''عبودیت کے معنی اظہار فروتنی کے ہیں اور عبادت کے معنی اس سے بھی ایک درجہ آگے یعنی غایت درجہ فروتنی کے ہیں۔ اس کی مستحق صرف وہ ذات ہے جس کی مہربانیاں بے پایاں ہیں۔ اسی لیے ارشاد ہوا ہے: 'ان لا تعبدوا الا ایاہ'' 'صرف اسی کی عبادت کرو۔'' (مفردات راغب، بذیل مادہ ''عبد'')

معروف عربی لغت لسان العرب میں ہے:

''عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں۔ عبد الطاغوت یعنی اس نے طاغوت کی اطاعت کی اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا قول ہے: 'ایاك نعبد' یعنی ہم تیری ہی عاجزانہ اطاعت کرتے ہیں۔ اور لغت میں عبادت کے معنی اطاعت مع الخضوع ہیں چنانچہ وہ راستہ جو آمدورفت کی کثرت سے پامال ہو گیا ہو طریق معبد کہلاتا ہے۔''

(لسان العرب، ج ۳، ص ۲۷۲)

تاج العروس میں ہے:

''لغت میں عبادت کے معنی اطاعت مع الخضوع کے ہیں۔'' (تاج العروس، ج ۲، ص ۴۱)

مفسرین نے بھی عبادت کے یہی معنی لکھے ہیں۔ امام طبری فرماتے ہیں:

''جملہ اہل عرب کے نزدیک عبودیت کی اصل ذلت ہے اور اسی لیے وہ راستہ جو مسافروں کی آمدورفت کی کثرت سے پست و پامال ہو چکا ہو طریق معبد کہلاتا ہے۔ طرفہ کا شعر ہے:

تباری عتاقاً ناجیات، واتبعت
وظیفاً وظیفاً فوق مور معبد

(وہ تیز رفتار گھوڑیوں کا مقابلہ کرتی ہے اور ایک پیر پر کے پیچھے اور دوسرا پیر پامال راستے پر رکھتی چلی جاتی ہے۔)

اس شعر میں مور معبد سے مراد طریق معبد یعنی پامال راہ ہے۔ اور اسی طرح وہ اونٹ جسے سواری کے لیے رام کیا جا

چکا ہو بعیر معبد کہلاتا ہے۔عبد کو بھی اسی وجہ سے عبد یعنی غلام کہتے ہیں کہ وہ اپنے آقا کا مطیع ومنقاد ہوتا ہے۔اشعار عرب میں اس کے شواہد اس کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ مشکل ہے۔'' (تفسیر طبری، ج۱،ص۱۶۱)

صاحب کشاف لکھتے ہیں:

''عبادت نام ہے غایت درجہ خضوع وتذلل کا اور اسی لیے اس لفظ کا استعمال صرف اللہ کے سامنے خضوع کے لیے خاص ہے کیونکہ وہی آقا اور منعم حقیقی ہے اس لیے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے آگے خضوع وتذلل کا اظہار کیا جائے۔'' (الکشاف، ج۱،ص۹)

علامہ علاءالدین رقم طراز ہیں:

''عبادت انتہائی جھکاؤ اور پستی کا نام ہے (اعبادة اقصی غایة الخضوع و التذلل) غلام کو اسی لیے عبد کہتے ہیں کہ وہ بالکل جھکا ہوا اور مطیع ہوتا ہے۔'' (تفسیر خازن مع البغوی، ج۱،ص۱۵)

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

''لغت میں عبادت کے معنی ذلت کے ہیں۔'' (تفسیر ابن کثیر، ج۱،ص۲۵)

مفسرین اور اہل لغت کی اس تشریح سے واضح ہو گیا کہ عبادت میں ذلت اور خضوع کا مفہوم نمایاں ہے۔لیکن ان کے معنی میں تھوڑا فرق ہے۔صاحب لسان نے ذلت کے مفہوم کی وضاحت میں لکھا ہے:

''ذلت،قوت وشوکت اور غلبہ کی ضد ہے۔اس کے معنی کمزوری، درماندگی اور مغلوبیت کے ہیں۔الذلّ بالکسر کے معنی نرمی اور سہولت کے ہیں۔یہ صعوبت کی ضد ہے 'الذُّلُّ بالضم' (ضمہ کے ساتھ ذل) بھی اسی معنی میں آتا ہے۔ذلیل اور ذلول صفت کے طور پر آتا ہے۔ذلول کا استعمال غیر ذوی العقول کے ساتھ مخصوص ہے اور ذلت انسان کے لیے۔'ذلت الدابة' کا مطلب ہے کہ جانور سواری کے لیے رام ہو گیا۔'فرسٌ ذلولٌ' اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو سرکشی چھوڑ کر مطیع ہو گیا ہو، جس پر سواری آسان ہو گئی ہو۔طریق ذلیل اور طریق مذلل اس راستے کو کہتے ہیں جو پامال ہو کر ہموار ہو گیا ہو۔'ذلت القوافی للشاعر' کا مطلب ہے کہ شاعر کو قوافی پر پوری قدرت اور غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔تذلل کے معنی کمزور ہونا، مغلوب ہونا اور مطیع ہونا ہے۔''

(لسان العرب، بذیل مادہ ''ذل''۔مزید دیکھیں، المصباح المنیر لاحمد بن محمد)

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ ذلت اور تذلل کا مفہوم ہے سرکشی اور مزاحمت چھوڑ کر مغلوب اور تابع ہو جانا اس طرح کہ جو مغلوب ہو اس کے ظاہر و باطن سے پستی اور کمزوری ظاہر ہو۔اسی لیے طریق ذلیل یا مذلل اس راستے کو کہتے ہیں جو اس طرح پست و پامال ہو چکا ہو کہ اس پر چلنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور چلنے والا نہایت آسانی سے کسی

ادنیٰ رکاوٹ کے بغیر اس سے گزر جائے۔ اس قسم کے راستوں کی ظاہری صورت ان کی پستی اور مغلوبیت کی تصویر ہوتی ہے۔ اسی طرح ''فرس ذلول'' کے معنی، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، اس گھوڑے کے ہیں جس پر سواری آسان ہو، دوسرے لفظوں میں سوار کسی مزاحمت کے بغیر اس پر سواری کر سکے اور اس کی حرکات وسکنات سے صاف ظاہر ہو کہ وہ سواری کے لیے بالکل پست و مغلوب ہو چکا ہے، اس کے اندر سرکشی نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔

خضوع کے معنی جھکنے کے ہیں۔ 'خضعه الكبر و اخضعه' یعنی بڑھاپے نے اس کی کمر جھکا دی۔ ''انعام اخضع''، وہ شتر مرغ ہے جس کی گردن چرنے میں زمین تک جھک جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خضوع کا لفظ جوارح یعنی سر، گردن اور جسم کے جھکنے کے لیے آتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں آتا ہے کہ جب وہ کسی کو سر جھکا کر نماز پڑھتے دیکھتے تو گردن اٹھا دیتے اور فرماتے ''ليس الخضوع فى الركاب'' (خضوع گردن میں نہیں ہے) اور پھر دل کی طرف اشارہ کرتے کہ 'ههنا' (یہاں ہے)۔ اسی لیے خاضع کا اطلاق اس شخص پر بھی ہوتا ہے جو اپنا سر اور گردن مغلوب اور کمزور ہونے کی وجہ سے جھکا لے (الخاضع، المطاطى رأسه وعنقه للذل والاستكانة)

معلوم ہوا کہ خضوع کا لفظ اپنے اندر مغلوبیت کا جو پہلو رکھتا ہے اس میں ظاہر بدن کی مغلوبیت نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے یہ اطاعت وانقیاد کے معنی میں زیادہ مستعمل ہے۔ لسان العرب میں ہے: 'الخضوع الانقياد والمطاوعة'۔ لیکن اسی اطاعت وانقیاد پر خضوع کا اطلاق ہوگا جو رضا و رغبت کے ساتھ ہو۔ اسی لیے صاحب لسان نے خضوع کی تشریح میں انقیاد کے ساتھ مطاوعت (برضا اطاعت) کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن کبھی یہ جبری اطاعت کے لیے بھی آتا ہے۔[16]

یہاں یہ بات فراموش نہ ہو کہ عبادت کے لغوی معنی میں پرستش کا مفہوم بھی شامل ہے۔ تعبّد کے معنی تنسّک کے ہیں یعنی گوشہ گیر ہو کر کسی برتر ہستی کی یاد اور اس کی تعظیم میں مشغول ہونا۔ متعبّد وہ شخص ہے جو عبادت کے لیے گوشہ گیر ہو جائے۔ ''عبد به'' کا مطلب ہے: 'لزمه فلم يفارقه' یعنی اس سے وابستہ ہو گیا اور جدا نہ ہوا۔ مُعبّد کے معنی جہاں منقاد کے ہیں وہاں اس کے معنی معبود کے بھی ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

تقول لا تبقى عليك فاننى ارى المال عند المسكين معبدا

''میری بیوی ملامت کرتی ہے کہ نمود و دہش میں تو اپنا بھی خیال نہیں رکھتا۔ میں تو دیکھتی ہوں کہ مال بخیلوں کے یہاں پوجا جاتا ہے۔''

16؎ تفصیل کے لیے دیکھیں، لسان العرب، ج ۹، ص ۴۲۵-۴۲۷۔

قرآنی مفہوم

قرآن مجید کی بکثرت آیات میں عبادات اور اس کے مشتقات کا استعمال ہوا ہے اور اس سے اس کا واقعی مفہوم بالکل متعین ہو جاتا ہے، یعنی اطاعت مع الخضوع۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

قُلْ إِنِّیْ نُهِیْتُ أَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَاءَ نِیَ الْبَیِّنَاتُ مِنْ رَّبِّیْ وَأُمِرْتُ أَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ. (سورۂ مومن ۶۶)

''اے نبی، ان لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے ان کی عبادت سے منع کیا گیا ہے جنھیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو (میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں) جب کہ میرے رب کی طرف سے میرے پاس روشن دلائل آ چکے ہیں۔ اور مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں رب کائنات کے آگے اپنا سر جھکا دوں۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

قَالُوْا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِیْمَ وَإِسْمَاعِیْلَ وَإِسْحَاقَ إِلٰهاً وَاحِداً وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ. (سورۂ بقرہ ۱۳۳)

''انھوں (اولاد یعقوب) نے کہا کہ ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادا ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے جو تنہا معبود ہے اور ہم اسی کے مطیع و فرماں بردار ہوں گے۔''

مذکورہ دونوں آیتوں میں 'اُسْلِمَ' اور 'مُسْلِمُوْنَ' کے الفاظ دراصل 'اَعْبُدَ' اور 'نَعْبُدُ' کی معنوی وضاحت کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ اور یہ معلوم ہے کہ لغت میں اسلام[1] کے معنی اطاعت و فرماں برداری کے ہیں۔ بعض مقامات پر عبادت کے اس مفہوم کو کھول دیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

فَقَالُوا أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ. (سورۂ مومنون ۴۷)

''انھوں نے کہا، کیا ہم لوگ اپنے ہی جیسے دو آدمیوں کی بات مان لیں گے حالانکہ ان کی قوم (یعنی بنی اسرائیل) ہماری مطیع ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

یَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطَانَ إِنَّ الشَّیْطَانَ

''ابا جان، شیطان کی بندگی نہ کیجیے، بے شک شیطان

---

[1] اس لفظ کے مادہ میں خود کو حوالہ کر دینے کا مفہوم غالب ہے اور یہیں سے اس میں اطاعت و فرماں برداری کے معنی پیدا ہوئے۔

كَانَ لِلرَّحْمَنِ عَصِيّاً. (سورۂ مریم ۴۴) — نے اپنے رب کی نافرمانی کی ہے۔''

آخری آیت میں شیطان کی عبادت کے معنی اس کی اطاعت و پیروی کے ہیں۔ اس لیے کہ معروف معنی میں شیطان کی پرستش کوئی آدمی بھی نہیں کرتا ہے۔ آیت میں ''عَصِیّاً'' کا لفظ بھی اس معنی کی طرف رہبری کرتا ہے جس کے معنی نافرمان کے ہیں۔ مفسرین نے اس آیت کی تشریح میں عبادت کے معنی اطاعت ہی کے لکھے ہیں۔ علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

لا تعبد الشيطان ای لا تطعه فی عبادة هذه الاصنام. (تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۲۲۳) — ''شیطان کی عبادت نہ کرو یعنی ان بتوں کی پوجا کرنے میں اس کی اطاعت نہ کرو۔''

علامہ نسفیؒ لکھتے ہیں:

ای لاتطعه فيما سول من عبادة الصنم. (مدارک التنزیل، ج ۳، ص ۳۶، ۳۷) — ''یعنی ان بتوں کی پوجا کرنے کی گمراہی میں اس کی اطاعت نہ کرو۔''

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

ای لاتطعه فيما يامرك من الكفر و من اطاع شيئا فی معصية فقد عبده. (تفسیر قرطبی، ج ۱۱، ص ۱۱۱، مزید دیکھیں، فتح القدیر (شوکانی)، ج ۳، ص ۳۲۴) — ''جس کفر کا یہ تجھے حکم دیتا ہے اس میں اس کی بات نہ مان، اور جس نے نافرمانی میں کسی کی ادنیٰ اطاعت بھی کی تو گویا اس نے اس کی عبادت کی۔''

اس سلسلے میں قرآن مجید کی ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ. (سورۂ سبا ۴۱) — ''بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے۔''

اس آیت میں بھی عبادات کے معنی جنوں کی اطاعت کے ہیں۔ علامہ ابن جوزیؒ لکھتے ہیں:

بل كانوا يعبدون الجن ای يطيعون الشياطين فی عبادتهم. (زاد المسیر ج ۶، ص ۳۶۴، مزید دیکھیں، معالم التنزیل، بغوی، علی هامشه وفی النسفتی، ج ۳، ص ۳۲۸) — ''بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے یعنی ان کی عبادت کرنے میں شیاطین کی اطاعت کرتے تھے۔''

یہ آیت بھی قابل ملاحظہ ہے:

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِیْ آدَمَ أَنْ لَّا تَعْبُدُوا — ''اے بنی آدم، کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا

الشَّيُطَانَ. (سورۂ یٰسین ۶۰)

کہ تم شیطان کی عبادت نہیں کرو گے۔‘‘

اس آیت میں بھی شیطان کی عبادت کے معنی اس کی اطاعت کے ہیں۔ ابن جوزیؒ اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

الم اعهد اليكم اى الم امركم، الم اوصكم، ولا تعبدوا بمعنى لا تطيعوا، الشيطان هو ابليس زين لهم الشرك فاطاعوه. (زادالمسیر ج۷، ص۳۰)

’’کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا یعنی میں نے تمھیں حکم نہیں دیا، کیا تمھیں وصیت نہیں کی۔ اور ’لا تعبدوا ‘ بمعنی ’لا تطیعوا ‘ ہے یعنی اطاعت نہ کرو۔ شیطان سے مراد ابلیس ہے جس نے ان کے لیے شرک کو مزین کیا پس انھوں نے اس کی اطاعت کی۔‘‘

معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں عبادت کا لفظ واضح طور پر اطاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن ہر اطاعت کو عبادت نہیں کہیں گے۔ عبادت کا اطلاق صرف اس حالت پر ہوگا جس میں سر کے ساتھ دل بھی پوری طرح جھکا ہوا ہو، یعنی برضا و رغبت تابع داری اور سرافگندگی۔ اس کے برخلاف صورت کو قرآن مجید نے استکبار سے تعبیر کیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَمَن يَسُتَنكِفُ عَنُ عِبَادَتِهِ وَيَسُتَكُبِرُ فَسَيَحُشُرُهُمُ إِلَيُهِ جَمِيُعاً. (سورۂ نساء ۴:۱۷۲)

’’اور جو شخص اس کی عبادت (یعنی اطاعت و بندگی) کو اپنے لیے عار سمجھے گا اور استکبار کرے گا تو وہ (ایک دن) سب کو اپنے پاس جمع کرے گا (اور اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ کبریائی کے لائق کون ہے)۔‘‘

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَلِلّٰهِ يَسُجُدُ مَا فِيُ السَّمَاوَاتِ وَمَا فِيُ الأَرُضِ مِن دَآبَّةٍ وَالُمَلآئِكَةُ وَهُمُ لَا يَسُتَكُبِرُونَ. (سورۂ نحل ۴۹)

’’آسمانوں اور زمین کی تمام ذی حیات مخلوقات اور فرشتے سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں اور وہ استکبار نہیں کرتے۔‘‘

اس آخری آیت میں سجدہ کے لفظ نے استکبار کے معنی کو بالکل متعین کر دیا ہے یعنی خدا کے بالمقابل اپنی ہستی کو بڑا سمجھنا اور اس کے سامنے سر اطاعت جھکانے سے اعراض کرنا، اس لیے لازماً عبادت کے معنی ہوئے، خدا کے بالمقابل اپنی ہستی کو حقیر ترین سمجھنا اور اس کے آگے سر اطاعت خم کرنا۔ لیکن عبادت میں جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا، اطاعت مع الخضوع یعنی برضا و رغبت تابعداری کا مفہوم غالب ہے۔

حقیقت عبادت

عبادت کے مذکورہ بالا لغوی اور قرآنی مفہوم کی روشنی میں دیکھیں تو اسلام میں عبادت کی حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز خواہ چھوٹی ہو یا بڑی خدا کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی کر رہی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَـهُ أَسۡلَمَ مَن فِيۡ السَّمَاوَاتِ وَالۡأَرۡضِ طَوۡعاً وَكَرۡهاً. (آل عمران ۸۳)

''آسمانوں اور زمین میں جو بھی زندہ وجود ہے وہ اس کے آگے، خواہ خوشی سے اور خواہ جبر سے، سرفگندہ ہے۔''

جبری اطاعت کا قانون پوری کائنات میں نافذ ہے۔ اس قانون سے انسان کی تکوینی زندگی بھی مستثنیٰ نہیں ہے لیکن اس کی تمدنی اور اخلاقی زندگی اس جبری اطاعت سے آزاد ہے۔ زندگی کے اسی حصے کو اپنی خوشی سے خدا کی مرضی کے تابع کر دینا حقیقی معنی میں عبادت ہے، اور یہی اسلام کی حقیقت بھی ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

قَـالُواۡ نَعۡبُدُ إِلَـهَكَ وَإِلَـهَ آبَائِكَ إِبۡرَاهِيۡمَ وَإِسۡمَـاعِيۡـلَ وَإِسۡحَـاقَ إِلَـهاً وَاحِداً وَنَحۡنُ لَهُ مُسۡلِمُونَ. (سورۂ بقرہ ۱۳۳)

''انھوں نے کہا، ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی، جو تنہا معبود ہے، عبادت کریں گے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہوں گے۔''

اور یہی انسان کی غایت تخلیق بھی ہے:

وَمَـا خَـلَـقۡـتُ الۡـجِـنَّ وَالۡـإِنـسَ إِلَّا لِيَعۡبُدُونِ. (سورۂ ذاریات ۵۶)

''ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔''

اس آیت میں جس عبادت کو انسان کی غایت تخلیق کہا گیا ہے وہ دل کی کامل رضا و رغبت کے ساتھ خدا کی فرماں برداری ہے۔ اسلام میں ایک عبادت گزار سے جہاں یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے اعضاء و جوارح سے خدا کے سامنے عجز و تذلل کا اظہار کرے، جسے عرف عام میں پرستش سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہاں اس سے یہ بھی مطلوب ہے کہ وہ معاملات زندگی میں دل کی مکمل رضا کے ساتھ حتّی المقدور خدا کی فرماں برداری کرے اور اس کی نافرمانی سے بچے۔ بندے کے اس عابدانہ رویے کا نام قرآن مجید کی زبان میں تقویٰ ہے۔ عبادت اور تقویٰ میں گہرا رشتہ ہے۔

[باقی]